نیا اُردُو نصاب

بشیر احمد صدیقی

# نیا اُردو نِصَاب

برائے جماعت دوازدہم

(پرچہ دوم۔ نثر)

برائے

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، حیدرآباد، سندھ

ناشر

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

Taqiuddin

# نیا اُردو نصاب

## لازمی

(پرچہ دوم۔ نثر)
برائے جماعت دوازدہم

برائے

سندھ ٹیکسٹ بُک بورڈ، حیدر آباد سندھ

ناشر:

اُردو اکیڈمی سندھ کراچی

| تاریخ اشاعت | ایڈیشن نمبر | تعداد اشاعت |
|---|---|---|
| اکتوبر سنہ 1972ء | پہلی بار | 4000 |
| دسمبر سنہ 1972ء | دوسری بار | 4000 |

★

منظور و رائج کردہ
بورڈ آف انٹر میڈیٹ و سیکنڈری ایجوکیشن
کراچی و حیدرآباد

★

مؤلف
بشیر احمد صدیقی

★

مدیر اعلیٰ
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
صدر شعبہ اردو ، جامعہ کراچی

★

مطبوعہ
باب الاسلام پرنٹنگ پریس ، کراچی

# فہرست مضامین

# اعتراف

حقوق اشاعت و طباعت کے سلسلے میں مؤلفین اور ثانوی تعلیمی بورڈ کراچی اس انتخاب کے لیے خاص طور پر حسب ذیل مصنفین ، مؤلفین اور ان کے ناشرین کے شکر گزار ہیں - بعض صورتوں میں مصنفین اور ناشرین نے ان کے استعمال کی اجازت دی ہے اور دیگر صورتوں میں کاپی رائٹ ایکٹ کی پابندی کی گئی ہے -

پریم چند ( بڑے بھائی صاحب ) ، غلام عباس ( دو تماشے ) ،
کرشن چندر ( موہنجو ڈارو کا خزانہ ) ،
خواجہ حسن نظامی ( شہزادی کی بپتا ) ،
احمد ندیم قاسمی ( پرمیشر سنگھ ) ،
مرزا عظیم بیگ چغتائی ( ممتحن کا پان )
عصمت چغتائی ( بیلو کی پٹائی ) ،
ابو الفضل صدیقی ( بھیا دیوج ) ،
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ( نقش آخر ) ،
پروفیسر محمد مجیب ( انجام ) ،
ڈاکٹر عابد حسین ( پردۂ غفلت ) ،
سید امتیاز علی تاج ( انار کلی کے دیوار میں چنے جانے کے بعد ثریا اور سلیم کا تاثر ) ،
اوپندر ناتھ اشک ( قید حیات ) ،
صالحہ عابد حسین ( دست گیر ) ،
میرزا ادیب ( فن کار ) -

# پیش لفظ

تعلیم کا مقصد اخلاق کی درستی اور انسان کو معاشرے کا ایک مفید رکن بنانا ہے ۔ اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو تعلیم کو تعلیم کہنا مشکل ہے ۔ اگر محض حصول معاش ہی علم حاصل کرنے کا مقصد ہو تو شاید اس کام کے لیے بعض دوسری تدابیر تعلیم سے زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہیں لیکن ایک عرصے تک ہماری تعلیم کا منشا یہی رہا کہ لوگ ادنیٰ اور اعلیٰ سرکاری ملازمتیں حاصل کرسکیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھے لکھے لوگوں کی ایک اچھی خاصی جماعت ملک میں پیدا ہوگئی لیکن ایسے افراد کم پیدا ہوئے جن میں حب وطن ، اسلامی اخوت ، خلوص ، ایمان ، جرأت اور ایثار کے اخلاق حسنہ ہوں ۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہماری تعلیمی منصوبہ بندی ایک غیر قوم کے ہاتھوں میں تھی جو اسے اپنے مقاصد اور ضروریات کی تکمیل کا ایک وسیلہ سمجھتی تھی ۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس علاقے کے بسنے والوں کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا کہ وہ ایک ایسی فضا میں سانس لینے لگے جہاں آزادی ہے ۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کر سکتے تھے جو ان کے قومی اور ملی ولولوں اور نصب العین کے مطابق ہو ۔

اس مقصد کے حصول کے لیے نظام تعلم اور نصاب تعلیم دونوں میں بڑی تبدیلی کی ضرورت تھی ۔ پاکستان کے قیام کے بعد کئی سال تقسیم ملک کے اثرات اور نتائج کی نذر ہو گئے ۔

پھر سارا ملک ریشہ دوانیوں ، خود غرضی اور سازش کا ایسا شکار ہوا کہ سارے تعمیری منصوبے خاک میں مل گئے - بالآخر ان حالات سے نجات ملتے ہی حکومت نے قومی تعلیمی منصوبہ بندی کا ایک کمیشن مقرر کیا اور اسی کمیشن کی سفارشات کا نتیجہ ایک نیا نصاب تعلیم ہے - اس نئے نصاب کے لیے آردو کی کتابوں کا جو سلسلہ کراچی بورڈ نے تیار کرایا ہے ، یہ اس سلسلے کی ایک کتاب ہے -

تعلیمی کمیشن نے تعلیم کے جن مقاصد پر زور دیا ہے وہ اخلاق کی تعمیر ، اخوت ، انسانی ہمدردی ، حب وطن ، حق کی تلاش ، ملک اور ملت کی خدمت ، ایثار اور خلوص کے جذبات کی استواری ، اسلامی اور اپنی تہذیبی روایات کا فروغ ، اپنی زبان اور ادب پر فخر کا جذبہ اور اس کی خدمت کا شوق ہیں - ان مقاصد کے حصول کے لیے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی مدارج میں ایسے انتخابات نظم و نثر کی ضرورت ہے جو ان مطالبات کو پورا کریں جن سے طالب علموں میں بلند کردار پیدا کرنے کا شوق بڑھے ، اسلام سے اور اپنے وطن سے محبت پیدا ہو ، قومی بھلائی کو وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھیں اور اپنی زبان اور ادب کی ترقی میں حصہ لیں - ہمارا ادبی ورثہ ایسے شہ پاروں سے محروم نہیں ہے - کام صرف ان کا تلاش کرنا اور سلیقے سے مرتب کرنا ہے - ثانوی تعلیمی بورڈ کراچی نے جن حضرات کو اس خدمت پر مامور کیا تھا ، انھوں نے حتی الوسع نصاب مقررہ کو سامنے رکھ کر ان مقاصد کے حصول کے لیے بہترین ادب پاروں کا انتخاب کیا ہے -

ان انتخابات کے سلسلے میں دو باتیں اور خاص طور پر اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی جماعت تک زبان کی تدریس کا مقصد زبان شناسی ہے۔ ادب شناسی کی منزل اس کے بعد آتی ہے۔ اگرچہ ادبی ذوق کی تشکیل بھی اس دور سے شروع ہو جاتی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس منزل میں طالب علم زبان کا مزاج شناس ہو جائے۔ ادبی اور فنی باریکیوں کا شعور آہستہ آہستہ خود بخود فروغ پاتا رہے گا۔ جو نمونے ان انتخابات میں شامل ہیں وہ اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پارے ہیں، لیکن اس انتخاب میں انھیں صرف زبان شناسی اور زبان فہمی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے شامل کیا گیا ہے۔ اس کا بڑا دار و مدار اور انحصار اُن اساتذہ پر ہے جو انتخاب کو پڑھائیں گے کہ وہ اس مواد سے کہاں تک یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ سبق پڑھاتے وقت اس کا خیال رکھیں کہ طالب علم اِن انتخابات کو اخذ معانی کی نیت سے پڑھتے ہیں۔ الفاظ اور محاورات کے معنی، ان کا صحیح اور برمحل انتخاب، قواعد، صرف و نحو کا استعمال اس طرح ذہن نشین کرانا چاہیے کہ طالب علم سرسری مطالعے کے عادی نہ ہوجائیں۔ توقع ہے کہ اُستاد کی ہدایت اور نگرانی میں طلبا کتب لغت سے الفاظ اور محاورات کے معنی تلاش کرنے کی عادت ڈالیں گے کہ زبان شناسی کا یہ ایک عمدہ اصول ہے۔

دوسری بات ان انتخابات میں یہ ہے کہ طالب علموں کی ذہنی رسائی اور ان کی دلچسپیوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کوئی انتخاب ایسا نہیں ہے جو مضمون یا بیان کی کسی خامی

کی بنا پر طالب علموں میں بد دلی یا بے ذوقی پیدا کرے۔ توقع کی جاتی ہے کہ بعض انتخابات کو پڑھ کر طالب علموں میں اس سلسلے کی دوسری چیزیں پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہوگا۔ اگر اساتذہ مناسب رہبری کریں تو یہ شوق ادبی ذوق کی تعمیر کی بنیاد بن سکتا ہے۔ ہر سبق کے ساتھ استاد کو چاہیے کہ وہ مصنف کی دیگر تصانیف کی نشان دہی کرے اور طالب علموں کو فرصت کے اوقات میں ان کے مطالعے کا مشورہ دے۔ ایسے اشارات مصنفین کے حالات کے سلسلے میں بھی شامل ہیں، اساتذہ اپنے علم اور انتخابات سے یہ کام لے سکتے ہیں۔

اگر ان انتخابات سے طالب علموں کو اپنی زبان سے محبت پیدا ہوجائے، وہ اس کے ادبی ورثے سے واقف ہوجائیں، اس زبان کا مزاج پہچان لیں، الفاظ کے معنی کی تلاش اور ان کے صحیح استعمال کا شوق ان میں پیدا ہو جائے تو مؤلفین کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔

کراچی فروری سنہ ۱۹۶۲ء ابواللیث صدیقی

# میر امن دہلوی

اصل نام میر امان تھا اور تخلص لطف ۔ آپ کے آباؤ اجداد ، شہنشاہ ہمایوں کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے ۔ آپ کا خاندان آخری مغل تاجدار تک حکومت کا وفادار اور جاں نثار رہا ۔ میر امن کو اپنے دہلوی ہونے پر ناز تھا اور دہلی کی تباہی کا بڑا قلق تھا ۔ احمد شاہ ابدالی کی لوٹی کھسوٹی ہوئی دلی میں تیس چالیس سال گذارے ۔ آخر تنگ دستی کی بدولت یہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے ۔ عظیم آباد میں ۳۰ برس گزارنے کے بعد کلکتہ کا رخ کیا ۔ نواب دلاور جنگ نے اپنے چھوٹے بھائی کاظم خاں کا اتالیق مقرر کر دیا ۔ لیکن یہ نوکری دو سال سے زیادہ نہ نبھی ۔ اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی بنیاد پڑی ، تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو اردو سکھائی جائے ۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ منتظم دارالترجمہ و صدر شعبۂ ہندوستانی فورٹ ولیم کالج کی فرمائش پر میر امن نے تحسین کے قصہ ''نو طرز مرصع'' کو سلیس اردو میں لکھا ۔ تحسین نے فارسی قصہ چہار درویش کا آزاد ترجمہ کیا تھا ۔ مگر اس کی زبان بہت مقفیٰ اور

مسجع تھی - میر امن نے قصے کا تاریخی نام "باغ وبہار" رکھا - میر امن نے یہ قصہ سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھنا شروع کیا اور سنہ ۱۸۰۲ء میں تمام کیا - میر امن کی دوسری کتاب "گنج خوبی" ہے جو "اخلاق محسنی" کا ترجمہ ہے - افسوس کہ میر امن کی زندگی کے حالات اس سے زیادہ منظر عام پر نہیں آئے - اس لیے نہ ان کے سال ولادت کا علم ہے اور نہ سال وفات کا - نئی تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ میر امن سنہ ۱۸۰۶ء تک حیات رہے -

# خواجہ سگ پرست کی کہانی

خواجہ نے کہا: "اے بادشاہ! یہ مرد جو داہنی طرف ہے، غلام کا بڑا بھائی ہے اور جو بائیں کو کھڑا ہے منجھلا برادر ہے۔ میں ان دونوں سے چھوٹا ہوں۔ میرا باپ ملک فارس میں سوداگر تھا۔ جب میں چودہ برس کا ہوا قبلہ گاہ نے رحلت کی۔ جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور پھول اٹھ چکے، ایک روز ان دونوں بھائیوں نے مجھے کہا کہ "اب باپ کا مال جوکچھ ہے تقسیم کرلیں۔ جس کا دل جو چاہے سو کرے۔" میں نے سن کر کہا۔ "اے بھائیو! یہ کیا بات ہے! میں تمھارا غلام ہوں۔ بھائی چارے کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ ایک باپ مر گیا، تم دونوں میرے پدر کی جگہ میرے سر پر قائم ہو۔ ایک نان خشک چاہتا ہوں، جس سے زندگی بسر کروں اور تمھاری خدمت میں حاضر رہوں۔ مجھے حصے بخرے سے کیا کام! تمھارے آگے کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھرلوں گا اور تمھارے پاس رہوں گا۔ میں لڑکا ہوں، کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں۔ مجھ سے کیا ہو سکے گا۔ ابھی تو تم مجھے تربیت کرو۔"

یہ سن کر انھوں نے جواب دیا کہ "تو چاہتا ہے اپنے ساتھ ہمیں بھی خراب اور محتاج کرے۔" میں چپکا ایک گوشے میں جاکر رونے لگا۔ پھر دل کو سمجھایا کہ بھائی آخر بزرگ ہیں۔ میری تعلیم کی خاطر چشم نمائی [1] کرتے ہیں کہ کچھ سیکھے۔

---

۱۔ مراد تنبیہ سے ہے۔

اسی فکر میں سو گیا - صبح کو ایک پیادہ قاضی کا آیا اور مجھے دارالشرع میں لے گیا - وہاں دیکھا تو یہی دونوں بھائی حاضر ہیں - قاضی نے کہا - " کیوں اپنے باپ کا ورثہ بانٹ چونٹ نہیں لیتا ؟ " میں نے گھر میں جو کہا تھا وہاں بھی وہی جواب دیا - بھائیوں نے کہا " اگر یہ بات اپنے دل سے کہتا ہے تو ہمیں لا دعویٰ لکھ دے کہ باپ کے مال سے مجھے کچھ علاقہ نہیں - " تب بھی میں نے یہی سمجھا کہ یہ دونوں میرے بزرگ ہیں میری نصیحت کے واسطے کہتے ہیں کہ باپ کا مال لے کر بے جا تصرف نہ کرے - بموجب ان کی مرضی کے فارغ خطی ۱ بہ مہر قاضی میں نے لکھ دی - یہ راضی ہوئے ، میں گھر آیا - دوسرے دن مجھ سے کہنے لگے - " اے بھائی ! یہ مکان جس میں تو رہتا ہے ہمیں درکار ہے - تو اپنی بود و باش کی خاطر اور جگہ لے کر جا رہ - " تب میں نے دریافت کیا کہ یہ باپ کی حویلی میں بھی میرے رہنے سے خوش نہیں - لاچار ارادہ اٹھ جانے کا کیا - جہاں پناہ ! جب میرا باپ جیتا تھا تو جس وقت سفر سے آتا ہر ایک ملک کا تحفہ بطریق سوغات کے لاتا اور مجھے دیتا - اس واسطے کہ چھوٹے بیٹے کو ہر کوئی زیادہ پیار کرتا ہے - میں نے ان کو بیچ بیچ کر تھوڑی سی اپنی نج کی پونجی بہم پہنچائی تھی - اسی سے کچھ خرید و فروخت کرتا - ایک بار ایک لونڈی میری خاطر ترکستان سے میرا باپ لایا اور ایک دفعہ گھوڑے لے کر آیا - ان میں سے ایک بچھڑا ناکند ۲ ، کہ ہونہار تھا وہ بھی مجھے دیا - میں اپنے پاس سے دانہ گھاس اس کا کرتا تھا -

---

۱ - بے دخلی -

۲ - دودھ کے دانتوں کا بچھڑا ، دو برس کی عمر تک کا گھوڑا -

آخر ان کی بے مروتی دیکھ، بیچ کر ایک حویلی خرید کی۔ وہاں جا رہا ۔ یہ کتا بھی میرے ساتھ چلا آیا ۔ واسطے ضروریات کے اسباب خانہ داری کا جمع کیا اور دو غلام خدمت کی خاطر مول لیے اور باقی پونجی سے ایک دکان بزازی کی کر کے خدا کے توکل پر بیٹھا۔ اپنی قسمت پر راضی تھا ۔ اگرچہ بھائیوں نے بد خلقی کی ، پر خدا جو مہربان ہوا ، تین برس کے عرصے میں ایسی دکان جمی کہ میں صاحب اعتبار ہوا ۔ سب سرکاروں میں جو تحفہ چاہتا میری ہی دکان سے جاتا ۔ اس میں بہت سے روپے کمائے اور نہایت فراغت سے گذرنے لگی ۔

اتفاقاً جمعہ کے روز میں گھر بیٹھا تھا کہ ایک غلام میرا سودے سلف کو بازار گیا تھا ، بعد ایک دم کے روتا ہوا آیا ۔ میں نے سبب پوچھا کہ تجھے کیا ہوا ؟ خفا ہو کر بولا کہ تمھیں کیا کام ہے ! تم خوشی مناؤ ۔ لیکن قیامت میں کیا جواب دو گے ؟ میں نے کہا ۔ اے حبشی ایسی کیا بلا تجھ پر نازل ہوئی ؟ اس نے کہا یہ غضب ہے کہ تمھارے بڑے بھائیوں کی چوک کے چوراہے میں ایک یہودی نے مشکیں باندھی ہیں اور قمچیاں مارتا ہے اور ہنستا ہے کہ اگر میرے روپے نہ دو گے تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا ۔ بھلا مجھے ثواب تو ہوگا ۔ پس تمھارے بھائیوں کی یہ نوبت اور تم بے فکر ہو، یہ بات اچھی ہے ؟ لوگ کیا کہیں گے ؟ یہ بات غلام سے سنتے ہی لہو نے جوش مارا ۔ ننگے پاؤں بازار کی طرف دوڑا اور غلاموں کو کہا ۔ جلد روپیہ لے کر آؤ۔ جوں ہی وہاں گیا دیکھا تو جو کچھ غلام نے کہا تھا سچ ہے ۔ ان پر مار پڑ رہی ہے ۔ حاکم کے پیادوں کو کہا واسطے خدا کے ذرا رہ جاؤ ۔ میں یہودی سے پوچھوں کہ ایسی کیا تقصیر کی ہے ، جس کے بدلے میں یہ تعزیر کی ہے ؟ یہ

کہہ کر میں یہودی کے نزدیک گیا اور کہا - آج روز آدینہ ۱ ہے - ان کو کیوں ضرب و شلاق ۲ کر رہا ہے ؟ اس نے جواب دیا - اگر حمایت کرتے ہو تو پوری کرو - ان کے عوض روپے حوالہ کرو ، نہیں تو اپنے گھر کی راہ لو - میں نے کہا - کیسے روپے ؟ دست آویز نکال ، میں روپے گن دیتا ہوں - اس نے کہا - تمسک حاکم کے پاس دے آیا ہوں - اتنے میں میرے دونوں غلام دو بدرے ۳ لے کر آئے - ہزار روپے میں نے یہودی کو دیے اور بھائیوں کو چھڑایا - ان کی یہ صورت ہو رہی تھی کہ بدن سے ننگے اور بھو کے پیاسے - اپنے ہمراہ گھر میں لایا اور انہیں حمام میں نہلوایا - نئی پوشاک پہنائی ، کھانا کھلایا - ہرگز ان سے یہ نہ کہا کہ اتنا مال باپ کا تم نے کیا کیا ؟ شاید شرمندہ ہوں -

اے بادشاہ ! یہ دونوں موجود ہیں ، پوچھیے ! سچ کہتا ہوں یا کوئی بات جھوٹ بھی ہے ! خیر جب کئی دن میں مار کی کوفت سے بحال ہوئے ایک روز میں نے کہا - ”اے بھائیو ! اب اس شہر میں تم بے اعتبار ہو گئے ہو - بہتر یہ ہے کہ چند روز سفر کرو -“ یہ سن کر چپ ہو رہے - میں نے معلوم کیا کہ راضی ہیں - سفر کی تیاری کرنے لگا - پال پرتل بار برداری اور سواری کی فکر کر کے بیس ہزار روپے کی جنس تجارت خرید کی - ایک قافلہ سوداگروں کا بخارا جاتا تھا ان کے ساتھ کر دیا - بعد ایک سال کے وہ کارواں پھر آیا - ان کی خیر خبر کچھ نہ پائی - آخر ایک آشنا سے قسمیں دے کر پوچھا - اس نے کہا، ”جب

---

۱ - روز آدینہ : جمعہ کا دن

۲ - شلاق: مکے اور گھونسے مارنا - تھپڑ مارنا -

۳ - بدرا : ایک ہزار کی تھیلی - بدرے جمع بدرا -

بخارا میں گئے ایک نے جوئے خانہ میں اپنا تمام مال ہار دیا۔ اب وہاں کی جاروب کشی کرتا ہے اور پھڑ[1] کو لیپتا پوتتا ہے۔ جواری جو جمع ہوتے ہیں ان کی خدمت کرتا ہے۔ وے بطریق خیرات کے کچھ دے دیتے ہیں۔ وہاں گرگا[2] بنا پڑا رہتا ہے اور دوسرا بوزہ[3] فروش کی لڑکی پر عاشق ہوا۔ اپنا سارا مال صرف کیا۔ اب وہ بوزہ خانہ کی ٹہل کیا کرتا ہے۔ قافلہ کے آدمی اس لیے نہیں کہتے کہ تو شرمندہ ہوگا۔''

یہ احوال اس شخص سے سن کر میری عجیب حالت ہوئی۔ مارے فکر کے نیند بھوک جاتی رہی۔ زاد راہ لے کر قصد بخارا کا کیا۔ جب وہاں پہنچا، دونوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے مکان میں لایا۔ غسل کروا کر نئی پوشاک پہنائی اور ان کی خجالت کے ڈر سے ایک بات منہ پر نہ رکھی۔ پھر مال سوداگری کا ان کے واسطے خریدا اور ارادہ گھر کا کیا۔ جب نزدیک نیشاپور کے آیا، ایک گاؤں میں مع مال اسباب ان کو چھوڑ کر گھر میں آیا۔ اس لیے کہ میرے آنے کی کسی کو خبر نہ ہو۔ بعد دو دن کے مشہور کیا کہ میرے بھائی سفر سے آئے ہیں۔ کل ان کے استقبال کی خاطر جاؤں گا۔ صبح کو چاہا کہ چلوں۔ ایک گرہست اسی موضع کا میرے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا۔ میں اس کی آواز سن کر باہر نکلا۔ اسے روتا دیکھ کر پوچھا کہ کیوں زاری کرتا ہے؟ وہ بولا، ''تمھارے بھائیوں کے سبب سے ہمارے گھر لوٹے گئے۔ کاش کہ ان کو تم وہاں نہ چھوڑ آتے۔''

میں نے پوچھا کہ ''کیا مصیبت گذری؟'' بولا کہ رات

---

۱۔ پھڑ: جو کھیلنے کا اڈا

۲۔ گرگا: چیلا مراد کمینہ۔ خدمت گذار

۳۔ بوزہ: ایک قسم کی شراب۔ بوزہ فروش، شراب بیچنے والا

کو ڈاکا آیا - ان کا مال و اسباب لوٹا اور ہمارے گھر بھی لوٹ لیے گئے - میں نے افسوس کیا اور پوچھا کہ اب وے دونوں کہاں ہیں؟ کہا "شہر کے باہر ننگے منگے خراب خستہ بیٹھے ہیں - " ونھیں دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ لے کر گیا ، پہنا کر گھر میں لایا - لوگ سن کر ان کو دیکھنے کو آتے تھے اور یہ مارے شرمندگی کے باہر نہ نکلتے تھے - تین مہینے اسی طرح گذرے - تب میں نے اپنے دل میں غور کی کہ کب تلک یہ کونے میں دبکے بیٹھے رہیں گے؟ بنے تو ان کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاؤں -

بھائیوں سے کہا - "اگر فرمائیے تو یہ فدوی آپ کے ساتھ چلے - " یہ سن کر خاموش ہو رہے ، پھر لوازمہ سفر کا اور جنس سوداگری کی تیار کر کے چلا اور ان کو ساتھ لیا - جس وقت مال کی زکوٰۃ دے کر اسباب کشتی پر چڑھایا اور لنگر اٹھایا ،ناؤ چلی، یہ کتا کنارے پر سو رہا تھا - جب چونکا اور جہاز کو مانجھ دھار میں دیکھا ، حیران ہو کر بھونکا اور دریا میں کود پڑا اور پیرنے لگا - میں نے ایک پنسوئی ۱ دوڑا دی - بارے سگ کو لے کر کشتی میں پہنچایا - ایک مہینہ خیر و عافیت سے دریا میں گذرا - کہیں منجھلا بھائی ایک دن بڑے بھائی سے کہنے لگا کہ چھوٹے بھائی کی منت اٹھانے سے بڑی شرمندگی حاصل ہوئی - اس کا تدارک کیا کریں ؟ بڑے نے جواب دیا کہ ایک صلاح دل میں ٹھہرائی ہے ، اگر بن آوے تو بڑی بات ہے - آخر دونوں نے مصلحت کر کے تجویز کی کہ اسے مار ڈالیں اور سارے مال و اسباب پر قابض و متصرف ہوں -

ایک دن میں جہاز کی کوٹھڑی میں سوتا تھا کہ منجھلا بھائی آیا اور جلدی سے مجھے جگایا - میں ہڑ بڑا کر چونکا اور باہر

---

۱ - پنسوئی : چھوٹی ڈونگی -

نکلا ۔ یہ کتا بھی میرے ساتھ ہولیا ۔ دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز کی باڑ پر ہاتھ ٹیکے نہوڑا ۱ ہوا تماشا دریا کا دیکھ رہا ہے اور مجھے پکارتا ہے ۔ میں نے پاس جا کر کہا ۔ '' خیر تو ہے؟'' بولا: عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے کہ دریائی آدمی موتی کی سیپیاں اور مونگے کے درخت ہاتھ میں لیے ہوئے ناچتے ہیں ۔ اگر اور کوئی ایسی بات خلاف قیاس کہتا تو میں نہ مانتا ۔ بڑے بھائی کے کہنے کو راست جانا ۔ دیکھنے کو سر جھکایا ۔ ہر چند نگاہ کی ، کچھ نظر نہ آیا اور وہ یہی کہتا رہا ۔ اب دیکھا ؟ لیکن کچھ ہو تو دیکھوں ۔ اس میں مجھے غافل پا کر مجلے نے اچانک پیچھے آ کر ایسا ڈھکیلا کہ بے اختیار پانی میں گر پڑا اور وے رونے دھونے لگے کہ دوڑیو ہمارا بھائی دریا میں ڈوبا ۔ اتنے میں ناؤ بڑھ گئی اور دریا کی لہر مجھے کہیں سے کہیں لے گئی ۔ غوطے پر غوطے کھاتا تھا اور موجوں میں چلا جاتا تھا ۔ آخر تھک گیا ۔ خدا کو یاد کرتا تھا ، کچھ بس نہ چلتا تھا ۔ ایک بارگی کسو چیز پر ہاتھ پڑا ، آنکھ کھول کر دیکھا تو یہی کتا تھا ۔ شاید جس دم مجھے دریا میں ڈالا میرے ساتھ یہ بھی کودا اور پیرتا ہوا میرے ساتھ لپٹا چلا جاتا تھا ۔ میں نے اس کی دم پکڑ لی ۔ اللہ نے اس کو میری زندگی کا سبب کیا ۔ سات دن اور رات یہی صورت گذری ۔ آٹھویں دن کنارے جا لگے ۔ طاقت مطلق نہ تھی ۔ لیٹے لیٹے کروٹیں کھا کر جوں توں اپنے تئیں خشکی میں ڈالا ۔ ایک دن بے ہوش پڑا رہا ، دوسرے دن کتے کی آواز کان میں آ گئی ، ہوش میں آیا ۔ خدا کا شکر بجا لایا ۔ ادھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ دور سے سواد ۲ شہر کا نظر آیا ، لیکن قوت کہاں

---

۱ ۔ نہوڑا : جھکا ہوا　　　۲ ۔ سواد : اطراف شہر

کہ ارادہ کروں - لاچار دو قدم چلتا ، پھر بیٹھتا ، اسی حالت سے شام تک کوس بھر راہ کاٹی -

بیچ میں ایک پہاڑ ملا - رات کو وہاں پڑ رہا - صبح کو شہر میں داخل ہوا - جب بازار میں گیا ، نان بائی اور حلوائیوں کی دکانیں نظر آئیں - دل ترسنے لگا - نہ پاس پیسہ جو خرید کروں ، نہ جی چاہے کہ مفت مانگوں - اسی طرح اپنے دل کو تسلی دیتا ہوا کہ اگلی دکان سے لوں گا ، چلا جاتا تھا - آخر طاقت نہ رہی اور پیٹ میں آگ لگی - نزدیک تھا کہ روح بدن سے نکلے ، ناگاہ دو جوانوں کو دیکھا کہ لباس عجم کا پہنے اور ہاتھ پکڑے چلے آتے ہیں - ان کو دیکھ کر خوش ہوا کہ یہ اپنے ملک کے انسان ہیں - شاید آشنا صورت ہوں - ان سے اپنا احوال کہوں گا - جب نزدیک آئے تو میرے دونوں برادر حقیقی تھے - دیکھ کر نپٹ شاد ہوا - شکر خدا کا کیا کہ خدا نے آبرو رکھ لی - غیر کے آگے ہاتھ نہ پسارا - نزدیک جا کر سلام کیا اور بڑے بھائی کا ہاتھ چوما - انھوں نے مجھے دیکھتے ہی غل و شور کیا - منجھلے بھائی نے طمانچہ مارا کہ میں لڑ کھڑا کر گر پڑا - بڑے بھائی کا دامن پکڑا کہ شاید یہ حمایت کرے گا - اس نے بھی لات ماری -

غرض دونوں نے مجھے خوب خورد و خام[1] کیا اور حضرت یوسف[ع] کے بھائیوں کا سا کام کیا - ہر چند میں نے خدا کے واسطے دیے اور گھگھیایا ، ہرگز رحم نہ کھایا - ایک خلقت اکٹھی ہوئی ، سب نے پوچھا "اس کا کیا گناہ ہے ؟" تب بھائیوں نے کہا کہ یہ (کمبخت) ہمارے بھائی کا نوکر تھا - سو اس کو دریا میں ڈال دیا اور مال و اسباب سب لے لیا - ہم مدت

---

۱ - خورد و خام کرنا : ذلیل کرنا

سے تلاش میں تھے ۔ آج اس صورت سے نظر آیا ۔ اور مجھ سے پوچھتے تھے کہ اے ظالم ! یہ کیا تیرے دل میں آیا کہ ہمارے بھائی کو مار کھپایا ؟ کیا ان نے تیری تقصیر کی تھی ؟ ان نے تجھ سے کیا برا سلوک کیا کہ اپنا مختار بنایا تھا ؟ پھر ان دونوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے اور بے اختیار جھوٹ موٹ اپنے بھائی کی خاطر روتے تھے اور لات مکی مجھ پر کرتے تھے ۔

اس اثنا میں حاکم کے پیادے آئے اور ان کو ڈانٹا کہ کیوں مارتے ہو ؟ اور میرا ہاتھ پکڑ کر کوتوال کے پاس لے گئے ۔ یہ دونوں بھی ساتھ چلے اور حاکم سے بھی یہی کہا اور بطور رشوت کے کچھ دے کر اپنا انصاف چاہا اور خون ناحق کا دعویٰ کیا ۔ حاکم نے مجھ سے پوچھا ۔ میری یہ حالت تھی کہ مارے بھوک اور مار پیٹ کے طاقت گویائی کی نہ تھی ، سر نیچے کیے کھڑا تھا ۔ کچھ منہ سے جواب نہ نکلا ۔ حاکم کو بھی یقین ہوا کہ یہ مقرر خونی ہے ۔ فرمایا کہ اسے میدان میں لے جا کر سولی دو ۔ جہاں پناہ ! میں نے روپئے دے کر ان کو یہودی کی قید سے چھڑایا تھا ، اس کے عوض انھوں نے روپیہ خرچ کرکے میری جان کا قصد کیا ۔ یہ دونوں حاضر ہیں ۔ ان سے پوچھیے کہ میں اس میں سرمو تفاوت کہتا ہوں ۔ خیر مجھے لے گئے ۔ جب دار کو دیکھا ، ہاتھ زندگی سے دھوئے ۔ سوائے اس کتے کے کوئی میرا رونے والا نہ تھا ۔ اس کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک آدمی کے پاؤں میں لوٹتا اور چلاتا تھا ۔ کوئی لکڑی کوئی پتھر سے مارتا لیکن یہ اس جگہ سے نہ سرکتا ۔ اور میں رو بقبلہ ہو کر خدا سے کہتا تھا کہ اس وقت میں تیری ذات کے سوا میرا کوئی نہیں جو آڑے آوے اور بے گناہ کو بچاوے ۔ اب تو ہی بچاوے

تو بچتا ہوں ۔ یہ کہہ کر کلمہ شہادت کا پڑھ کر تیورا [1] کر گر پڑا ۔ خدا کی حکمت سے اس شہر کے بادشاہ کو قولنج کی بیماری ہوئی ۔ امراء اور حکیم جمع ہوئے ۔ جو علاج کرتے تھے فائدہ نہ ہوتا تھا ۔ ایک بزرگ نے کہا کہ سب سے بہتر یہ دوا ہے کہ محتاجوں کو کچھ خیرات کرو اور بندی والوں کو آزاد کرو ۔ دوا سے دعا میں بڑا اثر ہے ۔ یہ سنتے ہی بادشاہی چیلے بندی خانوں [2] کی طرف دوڑے ۔ اتفاقاً ایک اس میدان میں آنکلا ۔ ازدحام دیکھ کر معلوم کیا کہ کسو کو سولی چڑھاتے ہیں ۔ یہ سنتے ہی گھوڑے کو دار کے نزدیک لا کر تلوار سے طنابیں کاٹ دیں ۔ حاکم کے پیادوں کو ڈانٹا اور تنبیہہ کی کہ ایسے وقت میں کہ بادشاہ کی یہ حالت ہے ، تم خدا کے بندے کو قتل کرتے ہو ، اور مجھے چھڑوا دیا ۔

---

۱- تیورا کر : چکر کھا کر ۔

۲- بندی خانہ : قید خانہ ۔

# حیدر بخش حیدری

سید حیدر بخش حیدری کے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے مگر فکر معاش اور دہلی کی عام مجلسی ابتری نے ان کو اس قدر تنگ کیا کہ یہ اپنے والد سید ابوالحسن کے ساتھ دہلی سے نکل کر بنارس آگئے۔ حیدری کو بنارس میں سکون حاصل ہوا اور موقع سے انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ یہاں نواب علی ابراہیم خاں خلیل اور قاضی عبدالرشید جیسے عالم اور قابل اشخاص نے ان کو دنیاوی اور دینوی تعلیم سے سرفراز فرمایا۔ حیدری نے "توتا کہانی" میں اپنے آپ کو مولوی غلام حسین غازی پوری کا شاگرد لکھا ہے۔

جان گل کرسٹ نے جب ہندوستان کے مختلف حصوں سے لائق اہل قلم فورٹ ولیم کالج کے لیے جمع کیے تو حیدری بھی وہاں پہنچے اور اردو ادب کی خدمت کرنے والوں میں شامل ہوگئے۔ حاتم طائی (آرائش محفل) ان کی مشہو کتاب ہے - ان کی دوسری کتابیں توتا کہانی، گلدستۂ حیدری، جامع القوانین اور قصہ مہروماہ ہیں۔ حیدری کا طرزنگارش رواں اور سلیس ہے۔ وہ نظم و نثر دونوں میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ سادگی اور شیرینی ان کی تحریر کی جان ہیں۔ اردو ادب میں ان کا ایک مقام ہے۔ انھوں نے سنہ ۱۸۲۳ء میں انتقال کیا۔

# حمام باد گرد

حاتم [1] شہر سے نکلا، جنگل کی راہ لی۔ ایک مدت کے بعد ایک بستی نظر آئی شہر پناہ [2] کے باہر ایک پیر مرد کھڑا تھا۔ وہ حاتم کو اپنے گھر لے گیا۔ ضیافت کے بعد پیر مرد نے پوچھا "اے جوان! تیرا کیا نام ہے؟" اس نے کہا "حاتم نام ہے اور یمن کا رہنے والا ہوں، حمام باد گرد کی خبر کو جاتا ہوں۔" اس نے سر نیچا کر لیا اور کہا "اے عزیز! وہ کون ہے، جو تیرا دشمن ہے جس نے تجھے اس جگہ بھیجا ہے۔ وہاں جو گیا پھر نہ پھرا جو کوئی وہاں جانے کا قصد کرے اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔ راستے میں حارث شہر قطان کا بادشاہ ہے۔ اس کی سرحد پر چوکی بیٹھی ہے کہ جو کوئی اس جگہ کی خواہش کرے پہلے اس کو میرے پاس لے آؤ۔ معلوم نہیں اس کو رو برو بلانے کی کیا وجہ ہے۔ مار ڈالتا ہے یا اس کو چھوڑ دیتا ہے۔" یہ سن کر حاتم نے کہا کہ "حسن بانو سوداگر بچی سے منیر شامی شادی کرنا چاہتا ہے۔ اپنا خانماں برباد کر کے اس شہر سے کارواں سرا میں بیٹھ رہا ہے۔ اس کے واسطے یہ رنج اپنے اوپر گوارا کر کے کئی برس سے اس کے کام میں عنداللہ پھرتا ہوں۔ اس سوداگر بچی کے چھ سوال خدا کے فضل و کرم سے پورے کر چکا ہوں۔ اب

---

۱ - حاتم: طے کا رہنے والا ایک مشہور سخی اور خادم خلق جس کے بارے میں ایک کتاب "قصہ حاتم طائی" لکھی گئی ہے۔

۲ - شہر پناہ: شہر کے چاروں طرف کی فصیل۔

ساتواں سوال حمام باد گرد کی خبر ہے ، سو لینے جاتا ہوں ۔ دیکھو قسمت کیا دکھائے ۔" پیر مرد بولا : " آفریں تجھ پر اور رحمت تیرے باپ اور ماں پر جو بیگانے کے واسطے عیش و عشرت کو چھوڑ کر محنت اختیار کی ، مصیبت سہی ۔"

حاتم ، (اس پیر مرد سے رخصت ہو حارث شاہ کے پاس پہنچا اور پھر) حارث شاہ کا شقہ لے کر حمام بادگرد کے دربان سے ملا ۔ وہ اس کو حمام کے دروازے پر لے گیا ۔ حاتم نے ایسا دروازہ عمر بھر نہ دیکھا تھا ۔ جو آنکھ اٹھا کر غور کیا تو عبرانی [1] میں اس پر لکھا ہوا پایا کہ " یہ طلسم کیومرث [2] کے وقت کا بنا ہے ۔ اس کا نشان مدتوں رہے گا اور جو کوئی اس طلسم میں جائے گا ، جیتا نہ نکلے گا ، وہیں بھوکا پیاسا سرگرداں رہے گا ۔ اگر اس کی زندگی ہے تو ایک باغ میں رہے گا ۔ وہاں جا کر اپنی حیات کے دن پورے کرے گا ۔ پھر باہر نہ نکل سکے گا ۔" حاتم نے لوگوں کو جو اس کے ساتھ گئے تھے ، رخصت کیا ۔ آپ اندر گیا ، دس بارہ قدم چل کر پیچھے دیکھا تو آدمیوں کو نہ پایا اور نہ دروازہ ہی نظر آیا ۔ مگر ایک جنگل لق و دق موجود تھا ۔ متفکر ہوا ۔ دائیں بائیں نکل کر اضطراب سے ادھر ادھر بھٹکتا رہا ۔ چند روز کے بعد ایک سمت کا راستہ لیا ۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک آدمی پر نظر پڑی ۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ اسی کی طرف آرہا ہے ۔ جب نزدیک پہنچا تو حاتم کو سلام کیا اور آئینہ بغل سے نکال کر حاتم کو دیا ۔ حاتم نے لے کر اپنا منہ دیکھا اور پوچھا کہ " تو تو حجام ہے جو آئینہ دکھا تا ہے"۔ اس نے کہا ۔ " البتہ جس شخص کو دیکھتا ہوں اسے لے جا کر حمام میں نہلاتا ہوں ۔

---

۱ ۔ خط عبرنی ۔ عبرانی رسم الخط جسے انگریزی میں Hebrew کہتے ہیں ۔

۲ ۔ کیومرث ۔ گودرز کا بیٹا ۔ ایک ایرانی پہلوان ۔

اگر آپ بھی چل کر حمام کریں تو آپ کی بدولت کچھ مل رہے گا۔" حاتم حجام کے ساتھ چلا۔ دو تین کوس چلے تھے کہ ایک گنبد نظر آیا۔ حجام حمام کے اندر گیا اور حاتم کو بلایا۔ وہ جونہی داخل ہوا، دروازہ بند ہو گیا۔ آخر کار حجام اسے ایک حوض پر لے گیا اور کہا کہ آپ اس میں اتریں تو میں بدن پر پانی ڈالوں۔ اور لنگی پاکیزہ، بہت تحفہ، حاتم کو باندھنے کو دی۔ جب وہ حوض میں اترا تو حجام نے ایک بڑا طاس گرم پانی سے بھر کر اس کے ہاتھ میں دے دیا، جو اس نے سر پر ڈال لیا۔ جب تیسری مرتبہ حاتم نے طاس سر پر ڈالا، وہیں ایک تڑاقا ہوا کہ حمام میں اندھیرا ہو گیا۔ ایک ساعت کے بعد تاریکی جاتی رہی تو کیا دیکھتا ہے کہ نہ حجام ہے نہ حمام ہے نہ حوض۔ ایک تراشا ہو گنبد ہے۔ اس کا تمام صحن پانی سے بھرا ہوا ہے۔ ایک دم نہ گزرا تھا کہ پانی پنڈلیوں تک آ گیا، حاتم عاجز ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پانی بڑھ کر گھٹنوں سے بھی اونچا ہو گیا۔ تب وہ گھبرایا۔ یکایک مضطرب ہو کر دروازے کی طرف بڑھا۔ چاروں طرف سر ٹکرایا، راستہ نہ پایا۔ اتنے میں پانی ڈوباؤ ہو گیا۔ یہ تیراک تھا، تیرنے لگا۔ الغرض اس قدر بلند ہوا کہ اس کا سر گنبد میں جا لگا۔ یہ نہایت ماندہ ہوا۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ قریب تھا کہ ایک ہی دفعہ بیٹھ جائے کہ ایک زنجیر لٹکی ہوئی دکھائی دی۔ حاتم نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے زنجیر پکڑ لی کہ پھر ویسی ہی آواز آئی اور اپنے آپ کو گنبد کے باہر جنگل میں کھڑا دیکھا۔ یکایک ایک عمارت عالی شان چمکتی ہوئی نظر آئی۔ اس طرف روانہ ہوا۔ جب نزدیک پہنچا ایک خوش قطع پر فضا باغ دیکھا جس کا دروازہ کھلا تھا۔ حاتم اندر چلا گیا۔ وہاں طرح طرح کے درخت میوہ دار دیکھے۔ بھوکا تو تھا ہی،

میوے توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ سو من کے قریب کھایا مگر پیٹ نہ بھرا ۔ جب کھاتے کھاتے تھک گیا تو پھرتا پھراتا ایک بارہ دری کے قریب جا پہنچا ۔ اس کے متصل بہت سے آدمی پتھر کے بنے ہوئے برہنہ کھڑے صرف ایک لنگ باندھے ہوئے تھے ، مگر وہ بھی پتھر کے ۔ اتنے میں ایک طوطی پنجرے میں دیکھی ۔ پنجرے پر لکھا تھا ”اے بندۂ خدا ! تو یہاں سے جان سلامت نہ لے جائے گا ، یہ طلسم کیومرث شاہ کا ہے ۔ ایک دن بادشاہ شکار کھیلتا ہوا اس جگہ آنکلا تھا ۔ یہاں اس نے ایک الماس پڑا دیکھا ۔ اٹھا کر تلوایا تو تین مثقال تھا ۔ سب نے کہا کہ حضرت آدمؑ کے وقت سے ایسا الماس کسی نے دیکھا نہ سنا ۔ اس پر بادشاہ نے وہ الماس اس طوطی کو نگلوایا اور طلسم حمام بادگرد بنوایا ۔ جواہر نگار کرسی پر کمان اور تیر اس لیے رکھ دے ہیں کہ جو کوئی اس طلسم میں وارد ہو اور یہاں سے نکلنے کا قصد کرے تو اس طوطی کے سر پر تیر مارے ، اگر نشانہ ٹھیک بیٹھا تو رہا ہو جائے گا ۔“ حاتم نے بسم اللہ کر کے کمان اٹھا لی اور ایک تیر مارا ۔ طوطی پھڑک کر پنجرے کی چھت سے لگ گئی ۔ تیر نے خطا کی ۔ حاتم گھٹنوں تک پتھر کا ہو گیا ۔ طوطی نے کہا ”یہاں سے جا ، یہ مکان تیرے لائق نہیں ۔“ حاتم وہاں سے مع تیر و کمان سو قدم پیچھے جا پڑا اور اس کے پاؤں اس قدر بھاری ہو گئے کہ اٹھ نہ سکا ۔ وہاں سے حاتم نے دوسرا تیر مارا لیکن وہ بھی خطا ہو گیا ۔ حاتم ناف تک پتھر کا ہو گیا ۔ اس وقت طوطی نے کہا ”اے جوان پیچھے سرک ۔ یہ جگہ تیرے لائق نہیں ۔“ حاتم نے جست کی اور دو سو قدم ہٹ کر بتوں کے پاس جا پڑا اب اس نے حالت یاس میں آنکھوں پر پٹی باندھی اور اللہ اکبر کہہ کر تیسرا تیر چھوڑا جس سے طوطی کی روح پرواز کر گئی ۔

اندھیرا ہو گیا - سوجھنے سے رہ گیا - اور اس قدر شور و غوغا بلند ہوا کہ حاتم بے ہوش ہو کر گر پڑا - ایک ساعت کے بعد آندھی رفع ہو گئی ، ابر جاتا رہا ، شور و غوغا موقوف ہو گیا - حاتم کے حواس بجا ہوئے تو اس نے دیکھا کہ نہ وہ حمام ہے ، نہ وہ باغ ، نہ وہ کرسی ، نہ وہ پنجرہ ، نہ وہ طوطی ، مگر ایک الماس زمین پر پڑا ہوا تارہ سا چمک رہا ہے - حاتم نے دوڑ کر اٹھا لیا اور سجدۂ شکر ادا کیا - سب پتھر کے بت زندہ ہو کر پھر اصل حالت میں آ گئے اور جب ان آدمیوں نے حاتم سے حقیقت معلوم کی تو اس کے قدموں پر گر پڑے اور کہا کہ ہم سب تیرے غلام ہیں - اس میں کئی شہزادے بھی تھے - حاتم ان کو لے کر شہر قطان میں آیا - حارث کو سب کچھ دکھایا اور کہا یہ آپ کی نذر ہے ، صرف یہ چاہتا ہوں کہ حسن بانو کو دکھا کر آپ کی خدمت میں پہنچا دوں - اس طرح پھر حاتم کئی مہینے کے عرصے میں بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ شاہ آباد میں داخل ہوا اور منیر شامی سے ملا -

(ماخوذ از آرائش محفل)

# رجب علی بیگ سرور

سرور کی پیدائش سنہ ۱۲۰۱ھ مطابق سنہ ۱۷۸۶ء لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی لکھنؤ میں ہوئی۔ عربی فارسی میں اچھی قابلیت بہم پہنچائی۔ اس زمانے کے لکھنؤ کے اساتذہ میں آغا نوازش حسین مشہور شاعر تھے۔ شاعری میں سرور ان کے شاگرد ہو گئے۔ نواب غازی الدین حیدر کی نوابی کا زمانہ تھا، انھوں نے کسی بات پر ناراض ہو کر ان کو جلاوطن کر دیا۔ سرور کانپور چلے گئے۔ وہاں وہ سخت پریشان رہے۔ کسی طرح جی نہ لگتا تھا اور برابر لکھنؤ آنے کے لیے کوشاں رہے۔ آخر کار نواب واجد علی شاہ کے عہد میں واپسی کا موقع ملا اور شعرائے دربار میں داخل ہوئے۔ انھوں نے حکم شاہی سے کتاب "شمشیر خانی" کا ترجمہ کیا جس کا نام "سرور سلطانی" رکھا گیا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے ایسے لوگوں کو خاص طور پر بالکل بے سہارا چھوڑ دیا۔ آخر کو مہاراجا بنارس کی طلبی پر بنارس پہنچے، وہاں کے قیام میں انھوں نے دو عمدہ کتابیں "گلزار سرور" اور "شبستان سرور" لکھیں جو ان کی انشا پردازی کے اچھے نمونے ہیں۔ بالآخر سنہ ۱۲۸۳ھ مطابق سنہ ۱۸۶۷ء میں وفات پائی۔ سرور کی

ایک اہم لیکن غیر مشہور کتاب "فسانۂ عبرت" ہے جس میں لکھنؤ کی بادشاہت کے آخری ایام اور انتزاع سلطنت کا حال لکھا ہے۔ سرور کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ "فسانۂ عجائب" ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ فسانہ عجائب ادب اردو میں ایک شاہکار ہے۔

لکھنؤ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ دہلی سے فوقیت لے جائے۔ چناں چہ اسی جذبے کے نتیجہ میں "فسانہ عجائب" معرض وجود میں آئی۔ میر امن کی "باغ و بہار" عمدہ، صاف اور سلاست میں لاجواب ہے۔ سرور کے "فسانہ عجائب" میں عبارت نہایت رنگین، مقفیٰ اور مسجع ہے۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء تک عام طور پر تحریری عبارت مرصع، مقفیٰ اور مسجع زبان میں ہوتی تھی، کیوں کہ فارسی کا مرغوب رنگ یہی تھا۔ اردو کا یہ رنگ اسی کی تقلید میں تھا اور یہی پر تکلف طرز نگارش قابلیت کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے سرور کی "فسانۂ عجائب" اس طرز کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طرز جس میں نظم کی طرح نثر میں بھی قافیہ کی پابندی ہوتی تھی ادائے مطلب کے لیے ایک بڑی رکاوٹ تھی اور اسی وجہ سے اکثر تحریر عمدہ الفاظ کا ایک جال اور پوری عبارت گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی تھی۔

سرور شاعر تھے لیکن ان کی نثر کی رنگینی اور دلچسپی کے آگے ان کی شاعری پھیکی ہے۔ اس زمانے میں صاحب دیوان ہونا شاعر کے لیے ضروری سا تھا۔ مگر سرور کا

دیوان اب کہیں نہیں ملتا ۔ ان کی بعض غزلیں ادھر
آدھر ضرور ملتی ہیں ۔ اس سے ان کی زبان دانی مسلم
ہوتی ہے ۔ شاعر ہونے کے علاوہ سرور ایک اعلیٰ درجہ
کے خطاط بھی تھے ۔

# شہزادہ جان عالم کی سواری

بلبل نواسنج ہزار داستان گلشن تقریر میں یوں چہکا ہے کہ بعد رسم شادی سیر و شکار کی اجازت ، سواری کا حکم شاہ ذوی الاقتدار [1] سے حاصل ہوا - گاہ گاہ شام و پگاہ [2] جان عالم سوار ہونے لگا - ایک روز گذر اس کا گذری [3] میں ہوا - انبوہ کثیر جم غفیر نظر آیا اور غلغلۂ تحسین و آفرین بلند پایا - شہزادہ ادھر متوجہ ہوا - دیکھا ایک مرد پیر نحیف ستر اسی برس کا سن ، نہایت ضعیف ، پنجرا ہاتھ میں لیے کھڑا ہے - اس میں ایک جانور مانند ساکنان جناں سبزپوش ، لطیفے، لطیف رنگین بیان کرتا ہے -

شہزادے کے دیکھتے ہی طوطا مالک سے بولا ، " اے شخص ! کوکب بخت تیرہ افلاس کے برج تیرہ سے نکلا - نصیب چمکا - دیکھ ایسا شہزادۂ حاتم شعار ، ابر گوہر بار متوجہ اس مشت پر ذرہ بے مقدار پر ہوا ہے ، وہ بیکار شے کارگاہ بے ثبات میں ہوں جس کا طالب نہیں کہیں - بحدیکہ جانور ہوں اور بلی کا کھاجا [4] مگر یہ جو نظر عنایت کرے ، ابھی تیرا ہاتھ پر زر ہو ، دامن گوہر سے بھرے۔"

جان عالم نے یہ سخن ہوشربا ، کلمۂ حیرت افزا سن ، طوطے

---

۱ - ذوی الاقتدار : دبدبے والا ، صاحب اقتدار

۲ - شام و پگاہ : صبح شام

۳ - گذری : وہ بازار جہاں عموماً نیلامی چیزیں بکتی ہیں -

۴ - کھاجا : خوراک -

عل کے آڑا، پنجرا اس جانور سحر بیان کا ہاتھ میں لے کے مالک سے قیمت پوچھی - طوطے نے کہا !

کب لگاتا ہے کوئی اس دل بے حال کا مول
سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول
(مولف)

مگر جو حضور کی مرضی - جان عالم نے لاکھ روپے خلعت کے سوا عنایت کیے اور پنجرا ہاتھ میں لیے دولت سرا کو روانہ ہوا - گھر میں جا ماہ طلعت کو طوطا دکھا یہ مصرع انشاء کا پڑھا :

بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لائے

طوطے نے شہزادے کو سخنان دلچسپ، قصص عجیب، حکایات غریب، شعر خوب، خمسہائے مرغوب سنا اپنے دام محبت میں اسیر کیا - یہ نوبت پہنچی کہ سوتے جاگتے دربار کے سوا جدا نہ ہوتا - جب دربار جاتا، پنجرا بتاکید حفاظت ماہ طلعت کو سونپ جاتا، اور دربار سے دیوانہ وار بشوق گفتار بیقرار جلد پھر آتا - ایک دن شاہزادہ دربار گیا - طوطا محل میں رہا - اس روز ماہ طلعت نے غسل کیا اور لباس مکلف سے جسم آراستہ، زیور پرتکلف سے پیراستہ ہو، جواہر نگار کرسی پر بیٹھی - ہوا جو لگی آئینہ میں صورت دیکھ خود محو تماشا ہوئی - بحر عجب و نخوت میں آشنا ہوئی - خواصوں سے، جلیسوں سے جو دم ساز محرم راز تھیں اپنے حسن کی داد چاہی - ہر ایک نے موافق عقل و شعور کے تعریف کی - کسی نے کہا، ہلال عید ہو، کوئی بولی، خدا جانتا ہے دید ہو نہ شنید ہو- اللہ تعالیٰ نے بایں کثرت مخلوقات تمھارا ہم سر از قسم جن و بشر بنایا نہیں - پری نے یہ قد بالا، حور نے یہ حسن کا جھمکڑا[۱] پایا نہیں - جب وہ کہہ چکیں، ماہ طلعت نے کہا

---

۱ - جھمکڑا : مجموعہ -

طوطا بہت عقل مند ، ذی شعور ، سیاح نزدیک و دور ہے ، اس سے بھی پوچھنا ضرور ہے ۔ مخاطب ہوئی ۔ "اے مرغ خوش خو و طائر سرخ رو ، بذلہ سنج ، بے رنج سچ کہنا ، اس سج دھج کی صورت کبھی تیرے طائر وہم و خیال کی نظر سے گذری ہے ۔ نیرنگیٔ چرخ کج رفتار ، فتنہ پردازی گردوں واژوں عیاں ہے ، آگاہ سب جہاں ہے ۔" اس وقت طوطا رنجیدہ دل ، کبیدہ خاطر ، مضمحل بیٹھا تھا ، چپ ہو رہا ۔ شہزادی نے پھر پوچھا ، طوطے نے بے اعتنائی سے کہا "ایسا ہی ہو ۔" یہ رنڈی ۱ معشوق مزاج ، طرہ یہ کہ شہزادہ کی جورو ، شوہر مالک تخت و تاج ، برہم ہو کے بولی "میاں مٹھو جینے سے خفا ہو جو ہمارے رو برو چبا چبا کر گفتگو کرتے ہو ؟" طوطے نے کہا "سوال و جواب اور دھمکانا اور حکومت سے ڈرانا ، غصے کی آنکھ دکھانا اور ہے ۔ کیوں اُلجھتی ہو ۔ شاید تم ہی سچی ہو ۔" پھر تو شعلہ غضب کا کانون ۲ سینۂ شہزادی میں مشتعل ہوا ۔ کہا "کیوں جانور بد تمیز ، ناچز تیری موت آئی ہے ۔ کیا بیہودہ ٹیں ٹیں مچائی ہے ۔ واہی بک رہا ہے ۔ ہمارا مرتبہ نہیں سمجھتا ہے ۔" طوطے کے منہ سے نکلا "کیوں اتنی خفا ہوتی ہو ۔ اپنا منہ ملاحظہ کرو ۔ صاحب تم بڑی خوب صورت ہو ۔" یہاں تو یہ حیص بیص تھی کہ جان عالم تشریف فرما ہوا ۔ عجب صحبت دیکھی کہ شہزادی بچشم پر آب و با دل کباب غیظ میں آ تھر تھراتھر طوطے سے بحث رہی ہے ۔ شہزادے نے فرمایا ، "خیر باشد ۔" طوطا بولا ، "آج نرا شر ہے ۔

---

۱ ۔ رنڈی: اردوئے قدیم میں صرف بہ معنی عورت بہ معنی طوائف بعد کا استعمال ہے ۔ نیز بعض علاقوں میں بیوہ کو رنڈی کہتے ہیں ۔ جس کے لیے عام اردو میں رانڈ استعمال ہوتا ہے ۔

۲ ۔ کانون : بھٹی ، انگیٹھی

خیر بخیر - مگر چندے حیات مستعار اس وحشی کی اور آب و دانہ قفس میں پینا کھانا باقی تھا - اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے ، تشریف نہ لاتے تو میرا طائر روح گربہ غضب شہزادی سے مجروح پرواز کر جاتا ، ہرگز جیتا نہ پاتے مگر پنجرا خالی دیکھ مزاج عالی پریشان ہوتا - بہ حسرت و افسوس یہ فرماتے - انشاء :

طوطا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا

ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدر ہوئی - شہزادے سے کہا کہ اگر میری بات کا طوطا صاف جواب نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلووں سے اس کی آنکھیں ملوں گی ، جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی - جان عالم نے کہا "کچھ حال تو کہو - " طوطے نے گذارش کیا حضور یہ مقدمہ غلام سے سنیے - آج شہزادی صاحبہ اپنی دانست میں بہت نکھر ، مصرع :

دیکھ آئینہ کو کہتی تھی کہ اللہ رے میں

پھر فرمایا مجھ سے ، تونے ایسی صورت کبھی دیکھی تھی - مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا ایسا ہی ہو - اس جرم قبیح پر شہزادی کے نزدیک کشتنی سوختنی گردن زدنی ہوں ، بقول میر تقی :

بے جرم تہہ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو
کچھ بات بری منہ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جان عالم نے کہا - "تم بھی کتنی عقل سے خالی ، حمق سے بھری ہو ، تم تو پری ہو جانور کی بات پر آزردہ ہو ، طائر پھر طائر ہے - " میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی ، آنکھ بدل کر روکھی صورت بنائی اور ٹیں سے بولے "خداوند نعمت ! جھوٹ جھوٹ ہے ، سچ سچ ہے ، ہمسر جس کا کوئی نہیں ہے وہ ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ہے - اس کے سوا ایک سے ایک

بہتر و برتر ہے ! وہ خود فرماتا ہے

فضلنا بعضکم علیٰ بعض [1] ۔ میں نے تو جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر ایک کلمہ کہا تھا ۔ اگر راستی پر ہوتا گردن کج کیے سیدھا گور میں سوتا ۔" یہ سن کے وہ اور رنجور ہوئی ۔ مثل مشہور ہے راج ہٹ ، تریاہٹ ، بالک ہٹ ۔ جان عالم نے مجبور ہو کے کہا " جو ہو سو ہو ۔ مٹھو پیارے سچ کہہ دو ۔" طوطے نے بہ منت عرض کی " دروغ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز ۔ مجھ سے سچ نہ بلوائیے ۔ میرا منہ نہ کھلوائیے ۔ انجام راستی حضور کے دشمنوں کو دشت نوردی ، بادیہ پیمائی ، غریب الوطنی ، کوچہ گردی نصیب ہوگی ۔" شہزادہ نے کہا " یہ جملہ تم نے اور نیا سنایا ۔ اب جو کچھ کہنا ہے کہا چاہیے ۔ باتیں بہت نہ بنائیے ۔ اس نے کہا ۔ " میں نے ہر چند چاہا ، آپ رنج سفر ، مصائب شہر بہ شہر ، ایذائے غربت سے باز رہیں کہ سفر اور سقر کی صورت ایک ہے ، اس سے بچنا نیک ہے مگر معلوم ہوا کہ حضور کے مقدر میں یہ امر لکھا ہے ۔ میرا قصور اس میں کیا ہے ۔ رفیع سودا ۔ شعر

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزن تدبیر ساری عمر گو سیتی رہے

سنیے قبلۂ عالم ! یہاں سے برس دن کی راہ شمال میں ایک ملک ہے ، عجائب زرنگار ، ایسا خطہ ہے کہ مرقع خیال مانی و بہزاد میں نہ کھنچا ہوگا اور پیر دہقان فلک نے مزرعۂ عالم میں نہ دیکھا ہوگا ۔ شہر خوب ، آبادی مرغوب ، رنڈی مرد حسین طرح دار ، مکان بلور کے بلکہ نور کے ، جواہر نگار ، عقل بار ہگ

---

۱ ۔ ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ۔

بینان مشاہدے سے دنگ ہو۔ خلقت اس کثرت سے بستی ہے کہ اس بستی میں وہم و فکر کو عرصہ تنگ ہو۔ خورشید ہر سحر اس کے دروازے سے ضیا پاتا ہے، بدر کامل اس شہر میں غیرت سے کاہیدہ ہو، ہلال نظر آتا ہے، وہاں کی شہزادی انجمن آرا، اس کا تو کیا کہنا، کہاں میری زبان میں طاقت اور دہان میں طلاقت جو شمہ مذکور شکل و شمائل اس زہرہ جبیں، فخر لعبتان لندن و چین کا سناؤں ۔ شعر

ایک میں کیا خود اگر دیکھے اسے حسن آفریں
اپنی صناعی پہ حیراں خود وہ صورت گر رہے

لیکن سات سو خواصیں زریں کمر، تاج دلبری بر سر، ماہرو عنبریں مو، سرگروہ خوبان جناں، جان جاناں، آرام دل مشتاقاں اس کی خدمت میں شب و روز سرگرم خدمت گزاری بڑی تیاری سے رہتی ہیں۔ اگر ان کی لونڈیوں کو شہزادی صاحبہ بنظر انصاف دیکھیں اور کچھ غیرت کو بھی کام فرمائیں، یقین تو ہے چلو بھر پانی میں محجوب ہو کے ڈوب جائیں۔" ماہ طلعت یہ سن کے سن ہوئی، سر جھکا لیا۔ جان عالم نے پنجرہ اٹھا لیا۔ دیوان خانہ میں لے جا، مفصل حال دریافت کرنے لگا۔ ہر دم دم سرد، دل پر درد سے بھرنے لگا۔

(ماخوذ از فسانہ عجائب)

# ڈپٹی نذیر احمد

نذیر احمد ضلع بجنور کے رہنے والے تھے - سنہ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے ، ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی اور اس کی تکمیل دہلی کالج میں ہوئی - ملازمت کے سلسلہ میں محکمۂ تعلیمات اور محکمہ مالیات سے وابستہ رہے - تالیف و تصنیف زندگی بھر ان کا محبوب مشغلہ رہا - علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت نے انھیں شمس العلماءؒ کا خطاب دیا - کئی تصانیف پر انعامات بھی ملے -

نذیر احمد اردو کے سب سے پہلے ناول نویس خیال کیے جاتے ہیں - انھوں نے معاشرتی اصلاح کے لیے کئی کتابیں لکھیں -

قانون کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا اور قرآن مجید کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ بھی کیا - غرض انھوں نے مختلف حیثیتوں سے اردو ادب کی خدمت کی - نذیر احمد کی تاریخ وفات ۳ مئی سنہ ۱۹۱۲ء ہے - نذیر احمد کی تحریر میں سادگی ، شگفتگی اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے - محاوروں کے استعمال کا انھیں بے حد شوق ہے اور اس پر خاصی قدرت بھی ہے - اگرچہ کہیں کہیں کوئی محاورہ بے محل بھی استعمال ہو گیا ہے - زور بیان

میں بعض جگہ عربی کے ثقیل الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جن کی وجہ سے عبارت کے حسن میں فرق آجاتا ہے۔ ان کی تحریر میں کسی قدر شوخی اور ظرافت بھی پائی جاتی ہے۔

تصانیف:۔ مراۃالعروس ، بنات‌النعش ، رو یائے صادقہ ، توبۃ النصوح ، فسانۂ مبتلا ، ابن الوقت ، عشرہ مبشرہ ، ترجمۂ قران مجید ، الحقوق و الفرائض وغیرہ۔

## نصوح اور چھوٹے بیٹے سلیم کی گفتگو

اگلے دن چھوٹا بیٹا سلیم ابھی سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ بیدارا نے آجگایا کہ صاحبزادے اٹھیے بالا خانے پر میاں بلاتے ہیں۔ سلیم کی عمر اس وقت کچھ کم دس برس کی تھی۔ سلیم نے جو طلب کی خبر سنی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے ہاتھ منہ دھو، ماں سے آکر پوچھنے لگا۔ اماں جان تم کو معلوم ہے، ابا جان نے کیوں بلایا ہے؟

ماں : بھائی مجھ کو کچھ خبر نہیں۔

سلیم : کچھ خفا تو نہیں ہیں۔

ماں : ابھی تو کوٹھے پر سے بھی نہیں اترے۔

سلیم : بیدارا تجھ کو کچھ معلوم ہے؟

بیدارا: میاں میں اوپر لوٹا لینے گئی تھی۔ میاں اکیلے بیٹھے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں آنے لگی تو میاں نے آپ کا نام لیا اور کہا کہ ان کو بھیج دیجیو۔

سلیم : صورت سے کچھ غصہ تو نہیں معلوم ہوتا تھا؟

بیدارا : نہیں تو۔

سلیم : تو اماں جان ذرا تم بھی میرے ساتھ چلو۔

ماں : میری گود میں لڑکی سوتی ہے۔ تم اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ جاتے کیوں نہیں؟

سلیم : کچھ پوچھیں گے؟

ماں : جو کچھ پوچھیں گے تم اس کا معقول طور پر جواب دینا۔

غرض سلیم ڈرتا ڈرتا اوپر گیا اور سلام کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ باپ نے پیار سے بلا کر پاس بٹھا لیا اور پوچھا۔ "کیوں صاحب، ابھی مدرسے نہیں گئے ؟"

بیٹا : جی بس جاتا ہوں، ابھی کوئی گھنٹے بھر کی دیر اور ہے۔

باپ : تم اپنے بھائی کے ساتھ مدرسے جاتے ہو یا الگ ؟

بیٹا : کبھی کبھار بھائی جان کے ساتھ چلا جاتا ہوں ورنہ اکثر اکیلا جاتا ہوں۔

باپ : کیوں ؟

بیٹا : اگلے مہینے امتحان ہونے والا ہے۔ چھوٹے بھائی جان اسی کے واسطے تیاری کر رہے ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر کسی ہم جماعت کے یہاں چلے جاتے ہیں۔ وہاں ان کو دیر ہوجاتی ہے، تو پھر گھر بھی نہیں آتے۔ میں جاتا ہوں تو ان کو مدرسے میں پاتا ہوں۔

باپ : کیا اپنے گھر میں جگہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے یہاں جاتے ہیں ؟

بیٹا : جگہ تو ہے مگر وہ کہتے تھے کہ یہاں بڑے بھائی جان کے پاس ہر وقت گنجفہ اور شطرنج ہوا کرتا ہے۔ اطمینان کے ساتھ پڑھنا نہیں ہو سکتا۔

باپ : تم بھی شطرنج کھیلنی جانتے ہو ؟

بیٹا : مہرے پہچانتا ہوں، چالیں جانتا ہوں، مگر کبھی خود کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

باپ : مگر زیادہ دنوں تک دیکھتے دیکھتے یقین ہے کہ تم بھی کھیلنے لگو گے۔

بیٹا : شاید مجھ کو عمر بھر شطرنج کھیلنی نہ آئے گی۔
باپ : کیوں ، کیا ایسی مشکل ہے ؟
بیٹا : مشکل ہو یا نہ ہو۔ میرا جی ہی نہیں لگتا۔
باپ : سبب ؟
بیٹا : میں پسند نہیں کرتا۔
باپ : چوں کہ مشکل ہے ، اکثر مبتدی گھبرایا کرتے ہیں۔مجھ کو یقین ہے کہ گنجفہ میں تمھاری طبیعت خوب لگتی ہوگی۔ وہ بہ نسبت شطرنج کے بہت آسان ہے۔
بیٹا : میں شطرنج کی نسبت گنجفہ کو زیادہ ناپسند کرتا ہوں۔
باپ : ہاں شطرنج میں طبیعت پر زور پڑتا ہے اور گنجفہ میں حافظہ پر۔
بیٹا : میری ناپسندیدگی کا خاص کر کچھ یہی سبب نہیں ہے بلکہ مجھ کو سارے کھیل برے معلوم ہوتے ہیں۔
باپ : تمھاری اس بات سے مجھ کو تعجب ہوتا ہے اور میں تم سے تمھاری ناپسندیدگی کا اصلی سبب سننا چاہتا ہوں کیوں کہ شاید اب سے پانچ یا چھ مہینے پہلے جن دنوں میں باہر کے مکان میں بیٹھا کرتا تھا ، میں نے خود تم کو ہر طرح کے کھیلوں میں نہایت شوق کے ساتھ شریک ہوتے دیکھا تھا۔
بیٹا : آپ درست فرماتے ہیں۔ میں ہمیشہ کھیل کے پیچھے دیوانہ بنا رہتا تھا۔ مگر اب تو مجھ کو ایک دلی نفرت ہوگئی ہے۔
باپ : آخر اس کا کوئی سبب خاص ہوگا۔
بیٹا : آپ نے اکثر چار لڑکوں کو کتابیں بغل میں دابے اندر گلی میں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔

باپ : وہی جو گورے گورے چار لڑکے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ پھڈی جوتیاں پہنے ، منڈے ہوئے سر ، آونچے پاجامے ، نیچی چولیاں ۔

بیٹا : ہاں جناب وہی چار لڑکے۔

باپ : پھر !

بیٹا : بھلا آپ نے کبھی ان کو کسی قسم کی شرارت بھی کرتے دیکھا ہے ؟

باپ : کبھی نہیں ۔

بیٹا : جناب کچھ عجب عادت ان لڑکوں کی ہے ، راہ چلتے ہیں تو گردن نیچی کیے ہوئے ، اپنے سے بڑا مل جائے ، جان پہچان ہو یا نہ ہو ان کو سلام کر لینا ضرور ۔ کئی برس سے اس محلے میں رہتے ہیں مگر کانوں کان خبر نہیں ۔ محلے میں کوڑیوں لڑکے بھرے پڑے ہیں لیکن ان کو کسی سے کچھ واسطہ نہیں ۔ آپس میں آوپر تلے کے چاروں بھائی ہیں ۔ نہ کبھی لڑتے ، نہ کبھی جھگڑتے ، نہ گالیاں بکتے ، نہ قسم کھاتے ، نہ جھوٹ بولتے ، نہ کسی کو چھیڑتے ، نہ کسی پر آوازے کستے ۔ ہمارے ہی مدرسے میں پڑھتے ہیں ۔ وہاں بھی ان کا یہی حال ہے ۔ کبھی کسی نے ان کی جھوٹی شکایت بھی تو نہیں کی ۔ ڈیڑھ بجے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوا کرتی ہے ۔ لڑکے کھیل کود میں لگ جاتے ہیں یہ چاروں بھائی ایک پاس کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں۔

باپ : بھلا پھر ؟

بیٹا : منجھلا لڑکا میرا ہم جماعت ہے ۔ ایک دن میں آموختہ

یاد نہ تھا ، مولوی صاحب نہایت ناخوش ہوئے اور اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے فرمایا کہ کمبخت گھر سے گھر ملا ہے - اسی کے پاس جا کر یاد کر لیا کر - میں نے جو پوچھا کیوں صاحب یاد کروا دیا کرو گے ، تو کہا ، بسر و چشم ۱ - غرض میں اگلے دن آن کے گھر گیا ، آواز دی - انھوں نے مجھ کو اندر بلا لیا - دیکھا کہ ایک بہت بوڑھی سی عورت تخت پر جائے نماز بچھائے ، قبلہ رو بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں - وہ ان لڑکوں کی نانی ہیں - لوگ ان کو حضرت بی کہتے ہیں - میں سیدھا سامنے دالان میں اپنے ہم جماعت کے ساتھ جا بیٹھا - حضرت بی اپنے پڑھنے سے فارغ ہوئیں تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا گو تم نے مجھ کو سلام نہیں کیا لیکن ضرور ہے کہ میں تم کو دعا دوں - جیتے رہو - عمر دراز ہو - خدا نیک ہدایت دے - ان کا یہ کہنا تھا کہ میں غیرت کے مارے زمین میں گڑ گیا اور فوراً میں نے اٹھ کر نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا - تب حضرت بی نے فرمایا کہ بیٹا برا مت ماننا یہ بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے جو بڑا ہوتا ہے اس کو سلام کر لیا کرتے ہیں - میں تم کو نہ ٹوکتی لیکن تم میرے بچوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو اس سبب سے مجھ کو جتا دینا ضرور تھا - اس کے بعد حضرت بی نے مجھ کو مٹھائی دی اور بڑا اصرار کر کے کھلائی - مدتوں میں ان کے گھر جاتا رہا - حضرت بی بھی مجھ کو اپنے نواسوں کی طرح چاہنے اور پیار کرنے لگیں اور مجھ کو ہمیشہ

۱ - مراد بڑی خوشی سے -

نصیحت کیا کرتی تھیں ۔ تب ہی سے میرا دل تمام کھیل کی باتوں سے کھٹا ہو گیا ۔

باپ : یہ تو تم نے اچھا اختصار کیا ۔ ابھی سب باتیں مجھ کو سناؤ، کیا کیا تم سے حضرت بی نے کہا؟

بیٹا : ہر روز آنے جانے سے میں ان لوگوں کے ساتھ خوب بے تکلف ہو گیا ۔ مگر حضرت بی نے بس پہلے دن سلام نہ کرنے پر ٹوکا تھا ، پھر کوئی گرفت نہیں کی ۔ باوجودیکہ میں شوخی بھی کیا کرتا تھا لیکن وہ خفا نہ ہوتی تھیں ۔ ایک دن مجھ سے اور ایک ہمسائے کے لڑکے سے باہر گلی میں کھیلتے کھیلتے عین انہی کے دروازے پر لڑائی ہو پڑی ۔ سخت کلامی کے بعد گالی گلوج کی نوبت پہنچی ۔ پھر مار کٹائی ہونے لگی ۔ لڑکا تھا مجھ سے کمزور ۔ ذرا اڑنگے پر چڑھا جو ایک پٹخنی دیتا ہوں ، چاروں خانے چت ۔ پھر تو میں اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور بچا کو ایسے گھسے دیے کہ یاد ہی کیے ہوں گے ۔ اگر لوگ چھڑوا نہ دیتے تو میں اس کو ادھ موا کر ہی چکا تھا ۔ بارے دو چار آدمیوں نے مجھ کو اس پر سے اتارا اور دو ایک نے میری پیٹھ بھی ٹھوکی کہ شاباش! پٹھے شاباش! لیکن وہ لڑکا ایسا چند باز[۱] تھا کہ پھر خم ٹھونک کر سامنے آ کھڑا ہوا ۔ میں چاہتا تھا کہ پھر گتھ[۲] جاؤں ۔ اتنے میں اندر سے امی میرے ہم جماعت نے آواز دی ۔ ادھر لوگوں نے کہا کہ میاں جانے بھی دو ۔ یہ تمہارے جوڑ کا نہیں ہے ۔ غرض میں اندر چلا گیا ۔ میرے ہم جماعت

---

۱ ۔ دھوکہ باز ، بے ایمان ۲ ۔ بھڑ جاؤں ۔

نے پوچھا کیوں جی کس سے لڑ رہے تھے؟ میں نے کہا ، یہی کنجڑے والا رمضانی ، کمزور مار کھانے کی نشانی ۔ لیکن خدا کی قسم میں نے بھی آج اس کو ایسا رگڑا ہے کہ یاد ہی تو کرے گا ۔ اس وقت تک غصہ اور طیش تو فرو ہوا ہی نہ تھا ۔ نہیں معلوم کیا کیا میں نے بکا کہ سب گھر والوں نے سن کر آنکھیں نیچی کرلیں اور بڑی دیر تک سرنگوں بیٹھے رہے ۔ آخر حضرت بی بولیں کہ سلیم بڑے افسوس کی بات ہے کہ تو ایسا پیارا لڑکا اور گن تیرے ایسے خراب ، اس منہ سے ایسی باتیں ۔ آج کئی دن سے میں تجھ کو سمجھانے والی تھی مگر اس وقت جو میں نے تیری گفتگو سنی مجھ کو یقین ہوگیا کہ تجھ کو سمجھانا بے سود ہے ۔ بڑا رنج تو مجھ کو اس بات کا ہے کہ تو ہاتھ سے گیا گزرا ہوا ، دوسرا کھٹکا یہ ہے کہ تو میرے لڑکوں کے پاس آتا جاتا ہے ۔ اگر خدا نخواستہ تیری خو بو ۱ کا ایک شمہ انھوں نے اختیار کیا تو میری طرف سے یہ جئے جی مرلیے ۔ ملنا جلنا تو بڑی بات ہے ، اب یہ محلہ مجھ کو چھوڑنا پڑا ۔ اتنی بے حیائی ، ایسی بدزبانی ۔ اول تو لڑنا اور پھر گلی کوچے میں اور اس پر ایسی موٹی موٹی گالیاں ۔

میں : خدا کی قسم میں نے ہرگز پہل نہیں کی وہ سر پر چڑھ کر مجھ سے لڑا ۔

حضرت بی: بس اپنی قسموں کو بند کرو ۔ میں قسم اور گالی دونوں کو برا سمجھتی ہوں ۔ جس کو بے موقع بے محل خدا کا

---

۱ ۔ عادت

نام لینے میں باک نہیں اس کو کسی بات کے بک دینے میں تامل نہیں۔

میں : گالی بھی پہلے اس نے مجھ کو دی -

حضرت بی: تم نے کیوں گالی کھانے کی بات کی ۔

میں : یہی تو میں عرض کرتا ہوں کہ میرا مطلق قصور نہ تھا -

حضرت بی: کیا ایسے بیہودہ لڑکے سے ملاقات رکھنا تمھارا قصور نہیں ہے -

میں : جناب آپ کو معلوم نہیں وہ لڑکا راہ چلتوں کے سر ہوتا ہے -

حضرت بی: یک نہ شد دو شد [1] دروغ گویم بر روئے تو [2]، میرے لڑکوں کے تو کوئی بھی سر نہیں ہوتا ۔

میں : ان سے تو سرے سے جان پہچان ہی نہیں -

حضرت بی: اور تم سے ہے ؟

میں : کیوں کر کہوں کہ نہیں ہے -

حضرت بی: ہے ، تو وہی تمھارا قصور ہے اور اسی کی یہ سزا ہے کہ تم نے بازار میں گالیاں کھائیں ۔

میں : لیکن میں نے بھی خوب ہی بدلا لیا ۔

حضرت بی: بس یہی تو تمھاری خرابی کے لچھن ہیں کہ تم اسی کو بدلا سمجھتے ہو ۔ اگر ایک شخص تمھارے ساتھ کچھ برائی کرے تو لوگ اس کو برا کہیں گے ۔

میں : ضرور کہیں گے -

حضرت بی: اور جب تم اس کے ساتھ زیادہ برائی کرو تو زیادہ

---

۱ - ایک نہ ہوئی دو ہوئی یعنی اب تو جرم اور بڑھ گیا .

۲ - تمھارے منہ پر جھوٹ بولتا ہوں ۔

برے نہ کہلاؤ گے؟ گالی بکنا ایک زبوں بات ہے۔ اس نے بکیں تو جھک مارا اور تم نے زیادہ بکیں تو زیادہ جھک مارا۔ سلیم! تم اپنے میں اور اس کنجڑے کے چھوکرے میں کچھ فرق سمجھتے ہو (یہ سن کر مجھ کو ندامت شروع ہوئی اور میں نے کہا کہ واقعی میں اس وقت تو مجھ میں اور اس میں کچھ فرق نہ تھا)۔

حضرت بی: لیکن وہ ایک بازاری آدمی کا بیٹا ہے اور تم ایک بڑے عزت دار کے لڑکے ہو۔ تمھارے دادا کا شہر میں وہ شہرہ ہے کہ ان کے نام کی لوگ تعظیم کرتے ہیں۔ ان ہی کے پوتے تم ہو۔ جھوٹ بولنے پر دلیر، قسم کھانے میں بےباک، فحش بکنے میں بےدھڑک۔ سلیم! کوئی شخص دین اور دنیا دونوں میں اس وجہ سے عزت نہیں پا سکتا کہ اس کے باپ دادا عزت دار تھے۔ آدمی کی عزت اس کی عادت اور مزاج سے ہے۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ عادتیں جو تم نے سیکھی ہیں عزت حاصل کرنے کی ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ سن کر مجھ کو اس قدر شرمندگی ہوئی کہ میں رونے لگا اور حضرت بی بھی آبدیدہ ہوئیں اور مجھ کو پاس بٹھا کر پیار کیا اور کہا کہ بیٹا میں تمھارے ہی فائدے کے لیے کہتی ہوں، اب بھی کچھ نہیں گیا، لیکن چند روز بعد تم کو ان عادتوں کا چھوڑنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں نے اسی وقت توبہ کی اور کہا کہ اگر اب سے آپ مجھ کو قسم کھاتے یا جھوٹ بولتے یا فحش بکتے یا بازاری لڑکوں میں

کھیلتے سنیں تو مجھ کو اپنے گھر میں نہ آنے دیجیے گا۔

باپ : کیا بس اسی دن سے تم کو کھیلنے سے نفرت ہو گئی ؟

بیٹا : جناب نہیں ، مہینوں میں حضرت بی کے یہاں جاتا رہا اور ہر روز وہ مجھ کو نصیحت کی دو چار باتیں بتایا کرتی تھیں۔ ایک روز انھوں نے مجھی سے میرے وقت کا حساب پوچھا۔ میں نے سونا ، کھانا اور کھیلنا اور تھوڑی دیر لکھنا پڑھنا بھتیرے کام گنوائے مگر انھوں نے سن کر ایک ایسی آہ کھینچی کہ آج تک اس کی چوٹ میں اپنے دل میں پاتا ہوں اور کہا " سلیم! آٹھ پہر میں خدا کا ایک کام بھی نہیں ۔ خدا نے تم کو آدمی بنایا ۔ کیا ممکن نہ تھا کہ وہ تم کو بلی یا کتا بنا دیتا ، پھر آدمی بھی بنایا تو ایسے خاندان کا جو عزت دار اور خوشحال ہے ۔ ہو سکتا تھا کہ تم مزدور یا لکڑہارے کے گھر پیدا ہوتے اور ایسی ہی چھوٹی سی عمر میں تم کو پیٹ پورا کرنے کے واسطے محنت کرنی پڑتی اور پھر بھی سوائے چبینے [1] کے کچھ بھی نہ پاتے اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں ۔ ایک لنگوٹی تم باندھے پھرتے ، نہ پاؤں میں جوتی اور نہ سر پر ٹوپی ، نہ گلے میں انگرکھا ۔ جہاں جاتے در در ، جس کے پاس کھڑے ہوتے پھٹ پھٹ ، پھر صورت تم کو پاکیزہ دی کہ جو دیکھے پیار کرے۔ کیا تم کو کالا بھٹ ، کانڑا ، لنگڑا ، کوڑھی بنا دینا اس کو مشکل تھا ! جس خدا کے تم پر اتنے سلوک اور اتنے احسان ہیں ، ستم ہے کہ دن رات میں ایک دفعہ بھی اس کے آگے سر نہ جھکاؤ۔ وا [2] ! غضب ہے کہ ایک لمحہ بھی اس کو یاد نہ کرو۔" تب

---

۱ ۔ دانے عموماً چنے کے ۔ ۲ ۔ افسوس ۔

حضرت بی نے مجھ کو نماز سکھائی ، اس کے معنی سمجھائے اور اسی طرح انھوں نے مجھ کو ہزارہا نصیحتیں کیں کہ بر زبان یاد نہیں رہیں ، مگر افسوس ہے کہ کئی مہینے سے ان کے گھر میرا جانا چھوٹ گیا۔" یہ کہہ کر سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

باپ : تم نے ان کے یہاں جانا کیوں ترک کیا ، کیا ان کے نواسوں سے لڑائی ہو گئی ؟

بیٹا : جناب ان کے نواسے مجھ کو بھائیوں سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔ اگر میں ان سے لڑتا تو دنیا میں مجھ سے زیادہ نالائق کوئی نہ تھا۔

باپ : تو کیا پھر حضرت بی تم سے ناخوش ہو گئیں ؟

بیٹا : استغفر اللہ ! وہ تو خود اس درجے کی نیک ہیں کہ غصہ ان کو چھو ہی نہیں گیا۔

باپ : تو کیا تم آپ سے آپ بیٹھ رہے ؟

بیٹا : میں تو ہر روز وہاں جانے کے واسطے تڑپتا ہوں۔

باپ : تو کیا تم کو کسی نے منع کر دیا ہے ؟

بیٹا : نہیں کسی نے منع بھی نہیں کیا۔

باپ : پھر کیا سبب ہوا ؟

بیٹا : اگر آپ مجھ کو اس کا سبب بیان کرنے سے معاف رکھتے تو بہتر تھا۔

باپ : نہیں ضرور ہے کہ میں تمھارے نہ جانے کا سبب معلوم کروں۔

بیٹا : اس میں ایک شخص کی شکایت ہوگی اور حضرت بی نے مجھ کو غیبت اور چغلی کی ممانعت کی ہے۔

باپ : لیکن کیا وہاں کے نہ جانے سے تمھارا نقصان نہیں ہے ؟

بیٹا : اے جناب ! نقصان سا نقصان ہے ، مگر میرے اختیار کی بات نہیں ۔

باپ : تو میں تم کو اپنے منصب پدری کی رو سے حکم دیتا ہوں کہ تم سارا حال پوست کندہ ۱ کرو ۔

بیٹا : جناب حضرت بی نے ایک مرتبہ مجھ کو بتاکید کہا تھا کہ تم اپنے سر کے بال منڈوا ڈالو ۔ اگرچہ مجھ کو بال بہت عزیز تھے اور میں ان کی خدمت بھی کرتا تھا لیکن چوں کہ مجھ کو یقین تھا کہ حضرت بی جو بات بھی کہتی ہیں ضرور میری منفعت کے واسطے کہتی ہیں ، میں نے کہا بہت خوب ۔ حضرت بی نے کچھ اور سبب تو نہیں بیان کیا مگر اتنا کہا کہ بالوں کی بزرگ داشت میں تمھارا بہت سا وقت صرف ہوتا ہے اور وقت ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے ایسی فضول باتوں میں صرف کیا جائے اور تم کو بڑے بال رکھنے کی کچھ ضرورت بھی نہیں ہے ۔ اگلے دن جو حجام بڑے بھائی جان کا خط بنانے آیا ، میں نے کہا ۔ خلیفہ میرے بال بھی مونڈ دینا ۔ بالوں کا مونڈنا سن کر بڑے بھائی جان اس قدر خفا ہوئے کہ میں عرض نہیں کر سکتا ۔ مجھ کو جو چاہتے کہہ لیتے ، حضرت بی اور ان کے نواسوں کو بہت برا بھلا کہا ۔ یہ کہہ کر سلیم کی آنکھوں میں بھر آنسو بھر آئے ۔

(ماخوذ از توبۃ النصوح)

---

۱ ۔ کھلم کھلا بیان کرو ۔ صاف صاف بتاؤ ۔

# منشی پریم چند

ولادت سنہ ۱۸۸۰ء وفات سنہ ۱۹۳۶ء

اصلی نام دھنپت رائے ، مگر ادبی دنیا میں پریم چند کے نام سے مشہور ہیں ۔ ضلع بنارس کے رہنے والے تھے ۔ ان کی تعلیم گھر پر اُردو فارسی سے شروع ہوئی ۔ اس کے بعد اسکول سے انٹرنس پاس کیا ۔ والد کا انتقال ہو جانے سے محکمۂ تعلیمات میں ملازمت کرلی ، لیکن نجی طور پر مطالعہ جاری رکھا ، پھر کچھ عرصہ بعد بی ۔ اے پاس کیا ۔ دوران ملازمت میں ہی سنہ ۱۹۰۱ء سے ادبی زندگی کا آغاز ہوا ۔ آخر میں سرکاری ملازمت چھوڑ کر ہمہ تن ادبی مشاغل میں لگ گئے ۔

جس طرح غزل میں میر استاد مانے گئے ہیں اسی طرح جدید افسانہ نگاری میں پریم چند کو اُستاد تسلیم کیا گیا ہے ۔ پریم چند کے افسانے جنوں، بھوتوں کے فرضی قصے نہیں بلکہ زندگی کی سچی اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں ۔ دیہاتی زندگی ان کا خاص موضوع ہے اور اپنے افسانوں کو انھوں نے اس کی اصلاح کا ذریعہ بنایا ہے ۔

پریم چند کا طرز تحریر سادہ اور دل نشین ہے ۔ ان کے یہاں چھوٹے چھوٹے فقرے ، سلیس اور رواں عبارت ملتی

ہے ۔ ان کے بیان میں بڑا زور اور اثر ہے ۔ دیہاتی زندگی کی تصویر کھینچنے میں انھیں کمال حاصل ہے اور وہ پہلے اہل قلم ہیں جنھوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا ۔ پریم چند صرف ایک بڑے افسانہ نگار ہی نہ تھے بلکہ اُردو کے اہم ترین ناول نگاروں میں بھی شمار کیے جاتے ہیں ۔ پریم چند کا اثر اُردو افسانہ پر بہت گہرا پڑا ہے ۔ ان کے مقلدین میں سدرشن ، علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کے نام ممتاز ہیں ۔

**تصانیف :۔**

زادراہ ، واردات ، پریم بتیسی ، میدان عمل ، گئودان ، فردوس خیال ، آخری تحفہ ، پردۂ مجاز ، خاک پروانہ ، بیوہ ، وغیرہ ۔

# بڑے بھائی صاحب

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے لیکن صرف تین درجے آگے۔ انھوں نے بھی اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا جب میں نے شروع کیا لیکن تعلیم جیسے اہم معاملے میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے ۔ اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے ، ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تاکہ عمارت پختہ ہو جائے۔

میں چھوٹا تھا ، وہ بڑے تھے - میری عمر نو سال تھی وہ چودہ سال کے تھے - ان کو میری تنبیہ اور نگرانی کا پورا اور پیدائشی حق تھا اور میری سعادت مندی اسی میں تھی کہ ان کے حکم کو قانون سمجھوں -

وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے - ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہا کرتے تھے اور شاید دماغ کو آرام دینے کے لیے کبھی کاپی پر کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں ، کتوں ، بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے تھے - کبھی کبھی ایک ہی نام کو دس بیس بار لکھ جاتے ، کبھی ایک شعر کو دس بیس بار خوش خط حروف میں نقل کرتے ، کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط نہ ہوتا ، نہ کوئی معنی - مثلاً ایک بار ان کی ایک کاپی میں میں نے یہ عبارت دیکھی - " اسپیشل آئینہ ، بھائیوں ، بھائیوں ، دراصل ، بھائی بھائی ، رادھے شیام ، شری یت رادھے شیام ، ایک

گھنٹے تک" اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی، اس عبارت میں کوئی معنی نکالوں لیکن ناکام رہا اور ان سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ نویں جماعت میں تھے میں پانچویں جماعت میں۔ ان کی تحریر سمجھنا میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا، ایک گھنٹہ بھی کتاب لے کر بیٹھنا بار خاطر تھا۔ موقع پاتے ہی ہوسٹل سے نکل کر میدان میں آجاتا اور کبھی کنکریاں اچھالتا، کبھی کاغذ کی تتلیاں اڑاتا اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا، کبھی چہار دیواری پر چڑھ کر پیچھے کود رہے ہیں، کبھی پھاٹک پر سوار موٹر کا لطف اٹھا رہے ہیں، لیکن کمرہ میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی اور سارا مزا کرکرا ہو جاتا۔ پہلا سوال ہوتا "کہاں تھے؟" اس کا جواب خاموشی کے سوا میرے پاس کچھ نہ ہوتا۔ نہ جانے کیوں میری زبان سے یہ بات نہ نکلتی کہ "ذرا باہر کھیل رہا تھا۔" میری خاموشی اعتراف گناہ سمجھی جاتی اور بھائی صاحب بزرگانہ محبت اور تندی سے ملے ہوئے لہجہ میں کہتے "اس طرح انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے ہی رہو گے اور ایک حرف نہ آئے گا۔ انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ جو چاہے پڑھ لے۔ اس طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے۔ یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں، خون جلانا پڑتا ہے، تب جا کر کہیں انگریزی آتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ تم اتنے کوڑ مغز[۱] ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے۔ میں کتنی محنت کرتا ہوں، یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو، اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمہارا

---

۱ - کودن - غبی۔

قصور ہے، تمھاری عقل کا قصور ہے۔ اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں، کبھی کہیں نہیں جاتا۔ روز کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے ہیں، میں قریب نہیں پھٹکتا۔ ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں۔ اس پر بھی دو دو تین تین سال ایک ایک درجہ میں پڑا رہتا ہوں ........ پھر تم کیسے امید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے۔ مجھے دو تین سال ہی لگتے ہیں تم ساری زندگی اسی درجہ میں پڑے سڑتے رہوگے۔ اگر تمھیں اس طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلی ڈنڈا کھیلو۔ دادا کی گاڑھی کمائی ہے۔ روپے کیوں برباد کرتے ہو۔''

میں پھٹکار سن کر آنسو بہانے لگتا۔ جواب ہی کیا تھا۔ بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں کمال تھا۔ ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی۔ اس طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت میں اپنے میں نہ پاتا تھا۔ اور ذرا دیر کے لیے مجھ پر مایوسی چھا جاتی اور میں سوچتا، کیوں نہ گھر چلا جاؤں، جو کام میرے بوتے[1] کے باہر ہے اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا، ٹائم ٹیبل بناتا، صبح اٹھنا، منہ دھو کر ناشتہ کرنا پھر انگریزی مطالعہ سات سے آٹھ بجے تک، حساب آٹھ سے نو تک، تاریخ نو سے ساڑھے نو تک، کھانا کھا کر اسکول جانا، ساڑھے تین بجے اسکول سے واپس، آدھ گھنٹے تک آرام، پانچ بجے تک جغرافیہ اور نقشہ، پانچ سے چھ تک گرامر، آدھ گھنٹہ آرام، ساڑھے چھ سے سات تک انگریزی کمپوزیشن، پھر کھانا، کھانا

۱ - قوت اور طاقت سے زیادہ

کھا کر آٹھ سے نو تک انگریزی ، نو سے دس تک اُردو ، دس سے گیارہ تک متفرق مضامین - مگر ٹائم ٹیبل بنا لینا ایک بات تھی ، اس پر عمل کرنا دوسری بات - پہلے ہی دن سے اس کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی - میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا ، وہ دلآویز ہریالی ، وہ پر لطف آزادی مجھے اضطراری [۱] طور پر کھینچ لے جاتی اور بھائی صاحب کو نصیحت اور فضیحت [۲] کرنے کا موقع مل جاتا - میں ان کے سائے سے بھاگتا ، ان کی نگاہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا - کمرے میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ انھیں خبر نہ ہو - ان کی نظر میری جانب اٹھی اور میری روح فنا ہوئی - ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر [۳] سی لٹکتی معلوم ہوتی ، کتابوں سے نفرت ہوتی جاتی تھی -

## (۲)

سالانہ امتحان ہوا ، بھائی صاحب فیل ہوگئے ، میں پاس ہوگیا اور درجہ میں اول آیا - میرے اور ان کے درمیان صرف دو درجوں کا تفاوت [۴] ہو گیا - جی میں آیا ، بھائی صاحب کو آڑے ہاتھوں لوں ، وہ آپ کی شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی ، مجھے دیکھیے مزے سے کھیلتا بھی رہا اور درجے میں اول ہوں ، لیکن وہ اس قدر پژمردہ [۵] اور شکستہ خاطر تھے کہ مجھے ان سے دلی ہمدردی ہوئی اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا - ہاں اب مجھے اپنے اوپر کچھ اعتماد پیدا ہوا ، اور بھائی صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا - آزادی سے کھیل کود میں شریک ہونے لگا - دل مضبوط تھا - اگر انھوں نے پھر فضیحت

---

۱ - بے اختیار و بے ارادہ    ۲ - مراد ہے برا بھلا کہنا ، رسوائی
۳ - ننگی تلوار -    ۴ - فرق    ۵ - افسردہ -

کی تو صاف کہہ دوں گا ، آپ نے اپنا خون جلا کر کون سا تیر مار لیا ، میں تو کھیلتے کودتے درجے میں اول آگیا ۔ زبان سے یہ ہیکڑی جتانے کی ہمت نہ ہونے پر بھی میرے بشرے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اب میں بھائی صاحب سے اتنا مرعوب نہیں ہوں ۔ بھائی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور ایک روز جب میں صبح کا سارا وقت گلی ڈنڈے کی نذر کر کے ٹھیک کھانے کے وقت لوٹا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے ۔ دیکھتا ہوں امسال پاس ہو گئے اور درجہ میں اول آگئے تو اب تمہیں دماغ ۱ ہوگیا ہے ۔ مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا ۔ تمہاری کیا ہستی ہے ۔ تاریخ میں راون کا حال تو پڑھا ہی ہوگا ۔ اس کی زندگی سے آخر تم نے کیا نتیجہ نکالا ۔ یوں ہی پڑھ گئے ۔ محض امتحان پاس کر لینا تو کوئی بڑی چیز نہیں ۔ اصل چیز ہے تاریخ سے سبق حاصل کرنا ۔ راون ساری دنیا کا مہاراجا تھا ایسے راجوں کو چکرورتی کہتے ہیں ۔ آج کل انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے مگر ان کو چکرورتی راجا نہیں کہہ سکتے ۔ راون چکرورتی راجا تھا ، بڑے بڑے دیوتا اس کی غلامی کرتے تھے ۔ آگ اور پانی کے دیوتا بھی اس کے غلام تھے ، مگر اس کا انجام کیا ہوا ۔ غرور نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا ، کوئی اس کو ایک چلو پانی تک دینے کو نہ بچا ۔ انسان اور چاہے جو برائی کرے ، غرور کیا اور دین و دنیا سے گیا ۔ ابلیس کا حال بھی پڑھا ہوگا ، اسے بھی غرور ہوا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنت سے دوزخ میں ڈھکیل دیا گیا ۔ شاہ روم نے بھی ایک بار غرور کیا تھا ، بھیک مانگ مانگ کر مر گیا ۔ تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا ہے اور ابھی سے تمہارا

---

۱ ۔ غرور ہو گیا ہے ۔

سر پھر گیا - تب تو تم آگے بڑھ چکے - یہ سمجھ لو کہ تم اپنی محنت سے نہیں پاس ہوئے، اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی - مگر بٹیر صرف ایک بار لگ سکتی ہے، بار بار نہیں لگ سکتی - کبھی گلی ڈنڈے میں بھی اندھے چوٹ نشانہ پڑ جاتا ہے - اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا - کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے - میرے فیل ہونے پر مت جاؤ، میرے درجہ میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آجائے گا - جب الجبرا اور جامیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور انگلستان کی تاریخ پڑھنی پڑے گی - بادشاہوں کے نام یاد رکھنا آسان نہیں، آٹھ آٹھ ہنری ہو گزرے ہیں - کونسا واقعہ کس ہنری کے زمانے میں ہوا، کیا اسے یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو- ہنری ساتویں کی جگہ ہنری آٹھویں لکھا اور سب نمبر غائب، صفر بھی نہ ملے گا، صفر بھی! ہو کس خیال میں- درجنوں تو جیمز ہوئے ہیں اور درجنوں ولیم، کوڑیوں چارلس، دماغ چکر کھانے لگتا ہے، ان کمبختوں کو نام بھی نہ جڑتے تھے - ایک ہی نام کے پیچھے دوم، سوم، چہارم، پنجم لگاتے چلے گئے اور جامیٹری تو بس خدا کی پناہ - ا ب ج کی جگہ ا ج ب لکھ دیا اور سارے نمبر کٹ گئے - کوئی ان بے رحم ممتحنوں سے نہیں پوچھتا کہ آخر ا ب ج اور ا ج ب میں کیا فرق ہے اور کیوں اس مہمل بات کے لیے طالب علموں کا خون کرتے ہو؟ دال بھات روٹی اور دال روٹی بھات میں کونسا فرق ہے - لیکن ممتحنوں کو کیا پروا، وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے - چاہتے ہیں کہ سب لڑکے رٹو ہو جائیں - اسی رٹنت کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے اور آخر ایسی بے سر پیر کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا - اس

خط پر عمود[1] گرا دو تو قاعدہ عمود سے دوگنا ہوگا ۔ اس سے کیا مطلب ؟ دوگنا نہیں چوگنا ہو جائے، آٹھ گنا ہو جائے ، میری بلا سے ۔ لیکن پڑھنا ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی۔ انگریزی مضامین لکھنے پڑتے ہیں ۔ کہہ دیا "وقت کی پابندی پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو ." اب کاپی کھولے ہوئے اس کے نام کو روئیے ۔ کون نہیں جانتا کہ وقت کی پابندی اچھی بات ہے لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھیے ؟ جو بات ایک جملے میں کہی جاسکے اس کے لکھنے کے لیے چار صفحے کی کیا ضرورت ! میں تو اسے حماقت کہتا ہوں ، مگر نہیں آپ کو چار صفحے لکھنے پڑیں گے ، جیسے چاہیے لکھیے اور صفحے بھی پورے فل اسکیپ سائز کے ۔ یہ لڑکوں پر ستم ناروا نہیں ہے تو کیا ہے ؟ ظالم اس پر بھی یہ کہتے جاتے ہیں کہ اختصار سے کام لو ۔ ایک ذرا سی بات پر تو آپ چار صفحے رنگواتے ہیں اور اس پر فرماتے ہیں کہ اختصار سے بھی کام لو ۔ تیز بھی دوڑئیے اور آہستہ آہستہ بھی ، ہے متضاد یا نہیں ۔ بچہ بھی سمجھ سکتا ہے ، لیکن ان ماسٹروں کو اتنی بھی تمیز نہیں ۔ اس پر بھی دعویٰ ہے کہ ہم ماسٹر ہیں ۔ میرے درجہ میں آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا ۔ اس درجہ میں اول آگئے ہو تو اتنا اتراتے ہو ۔ میرا کہنا مانیے ، لاکھ فیل ہو گیا لیکن تم سے بڑا ہوں ، دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ حاصل کیا ہے ۔ میرا کہنا مانو جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ[2] سے باندھو ورنہ پچھتاؤ گے ۔

---

۱ ۔ وہ خط مستقیم جو دوسرے خط مستقیم پر قائم ہو کر زاویہ متصلہ باہم برابر بنائے ۔

۲ ۔ گرہ میں باندھنا : کسی بات کے یاد رکھنے کے لیے رومال وغیرہ میں گانٹھ لگا لینا یعنی دل پر نقش کر لینا تا کہ بھولنے نہ پائے ۔

اسکول کا وقت قریب تھا ورنہ نہ جانے کب یہ نصیحت ختم ہوتی - مجھے آج کا کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوا - جب پاس ہو جانے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑیں گے- انھوں نے اپنے درجہ کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی تھی اس نے سچ مچ مجھے لرزا دیا - کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا ، یہی تعجب ہے لیکن یہ سب درگت ہونے پر بھی کتابوں سے میری بیزاری بدستور قائم رہی ، کھیل کود کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا - پڑھتا بھی تھا مگر بہت کم ، بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجہ میں ذلیل نہ ہونا پڑے- اپنے اوپر جو اعتماد پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہوگیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی -

(۳)

پھر سالانہ امتحان ہوا اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بے چارے بھائی صاحب پھر فیل ہوگئے - میں نے محنت زیادہ نہیں کی ، مگر خدا جانے کیسے درجہ میں اول آ گیا ، مجھے خود تعجب ہوا - بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی - دس بجے رات تک ، ادھر چار بجے صبح سے پھر آدھر چھ سے ساڑھے نو تک اسکول جانے سے قبل - چہرہ زرد ہوگیا تھا ، مگر فیل - مجھے ان پر رحم آتا تھا - نتیجہ سنایا گیا تو رو پڑے اور میں بھی رونے لگا -

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان اب صرف ایک درجہ کا تفاوت رہ گیا تھا - میرے دل میں ایک بیہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہوجائیں تو میں ان کے برابر ہوجاؤں، پھر کس بنا پر میری فضیحت کر سکیں گے - لیکن

میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا ۔ آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری ہی بھلائی کے لیے ۔ مجھے اس وقت نا گوار لگتا ہے ضرور ، مگر شاید ان کی تنبیہ کا ہی اثر ہے کہ میں یوں دنا دن پاس ہوتا جاتا ہوں اور اتنے اچھے نمبروں سے ۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے ۔ کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی انھوں نے تحمل [1] سے کام لیا ۔ شاید اب انھیں خود محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز [2] اب انھیں نہیں رہا یا رہا تو بہت کم ۔ میری بد معاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی ، میں ان کے تحمل کا نا جائز فائدہ اٹھانے لگا ۔ مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں تو پاس ہو ہی جاؤں گا ۔ پڑھوں یا نہ پڑھوں ، میری تقدیر اچھی ہے ۔ اس لیے بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑی بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا ، وہ بھی جاتا رہا ۔ مجھے کنکوے اڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا اور اب زیادہ تر کیا بلکہ سارا وقت اسی مشغلہ کی نذر ہوتا تھا ۔ پھر بھی میں بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا اور ان کی نظر بچا کر کنکوے اڑاتا تھا ۔ ساری جزئیات [3] در پردہ عمل میں آتی تھیں ۔ میں انھیں یہ گمان کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کی وقعت اور عزت میری نظروں میں کچھ کم ہوگئی ہے ۔

ایک روز شام کے وقت ہوسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ بھائی صاحب سے میری مڈ بھیڑ ہوگئی ۔ شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے ۔ انھوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے ” ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لیے دوڑتے تمھیں شرم نہیں آتی ۔

---

۱ - برداشت ۲ - حق

۳ - چھوٹے چھوٹے امور ، یہاں مراد کنکوے کے مراحل سے ہے ۔

تمھیں اس کا بھی کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو بلکہ آٹھویں جماعت میں آگئے ہو اور مجھ سے صرف ایک درجہ پیچھے ہو۔ آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ آٹھویں درجہ پاس کر کے نائب تحصیل دار ہو جاتے تھے۔ میں کتنے ہی مڈلچیوں [1] کو جانتا ہوں جو آج اول درجہ کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں۔ بی۔اے اور ایم۔اے والے ان کے ماتحت اور ان کے پیرو ہیں اور تم اسی آٹھویں درجہ میں آکر بازاری لونڈوں کے ساتھ کنکوے کے لیے دوڑ رہے ہو۔ افسوس ہے تمھاری نا عقلی پر۔ تم ذہین ہو، اس میں شک نہیں، لیکن وہ ذہن کس کام کی جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے۔ تم اپنے دل میں سمجھتے ہو گے کہ میں ان سے محض ایک درجہ پیچھے ہوں اور اب انھیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ میں تمھارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور چاہے آج تم میری ہی جماعت میں آجاؤ اور ممتحنوں کا یہی حال ہے تو یقیناً اگلے سال میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے، اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ۔ لیکن مجھ میں اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے اسے تم کیا خدا بھی نہیں مٹا سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور ہمیشہ بڑا رہوں گا۔ مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تم اس کے برابر کبھی نہیں آسکو گے چاہے تم ایم۔اے اور ایل۔ ڈی [2] ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ عقل کتابیں ہی پڑھ لینے سے نہیں آتی۔ ہماری اماں نے کوئی درجہ پاس نہیں کیا اور دادا بھی شاید پانچویں چھٹی جماعت سے آگے نہیں گئے

---

۱۔ مڈل پاس، برائے استہزا استعمال ہوا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر آف لا: قانون کی بڑی ڈگری ہے۔

لیکن ہم دونوں آج ساری دنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں اماں اور دادا کو ہمیں تنبیہہ کرنے کا ہمیشہ اختیار رہے گا۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ بزرگ ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ہم سے زیادہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے۔ امریکہ میں کس طرح کی حکومت ہے اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں کیں اور آسمان میں کتنے ستارے ہیں؟ یہ باتیں انہیں نہ معلوم ہوں لیکن ہزاروں باتیں ایسی ہیں جن کا علم انہیں ہم سے زیادہ ہے۔ آج میں خدا نخواستہ بیمار ہو جاؤں تو تمہارے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے، سوائے دادا کو تار دینے کے تمہیں اور کچھ نہ سوجھے گا، لیکن تمہاری جگہ دادا ہوں گے تو کسی کو تار نہ دیں گے بلکہ خود مرض کو پہچانیں گے اور خود علاج کریں گے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے۔ گھبرائیں گے نہیں، بد حواس نہ ہوں گے۔ ہمارے خرچ کے لیے وہ جو کچھ بھیجتے ہیں اسے ہم بیس بائیس تاریخ تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ ناشتہ بند کر دیتے ہیں، دھوبی اور نائی سے منہ چراتے ہیں، لیکن آج جتنا ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں اس کے نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عزت اور نیک نامی کے ساتھ بسر کیا ہے اور ایک کنبہ کی پرورش کی ہے، جس میں سب ملا کر نو آدمی تھے۔ یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم میرے قریب آگئے اور اب خود مختار ہو۔ میرے دیکھتے تم اپنی زندگی کبھی برباد نہ کرنے پاؤ گے۔ میں جانتا ہوں تمہیں میری باتیں زہر لگ رہی ہیں۔"

میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی ناسعادتمندی پر نادم ہو کر باچشم نم کہا۔ "ہرگز نہیں آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ معقول ہے اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے۔"

بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا اور بولے ”کنکوے اڑانے کو منع نہیں کرتا، میرا جی بھی کنکوے اڑانے کو کبھی کبھی للچاتا ہے۔ کروں کیا، خود بے راہ چلوں تو تمہیں ہدایت کیسے کروں۔ یہ فرض تو میرے سر پر ہے۔“

اتفاق سے اس وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گزرا۔ اس کی ڈور لٹک رہی تھی۔ بھائی صاحب لمبے تھے اچھل کر اس کی ڈور پکڑلی اور اسے لیے ہوئے ہوسٹل کی طرف دوڑے اور میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

# غلام عباس

غلام عباس نے لاہور میں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا ۔ وہ بچوں کا رسالہ پھول عرصہ تک مرتب کرتے رہے اور مولوی ممتاز علی کی ادبی سرگرمیوں میں شریک رہے ۔ ان کی ادبی شہرت کا آغاز ”جزیرۂ سخنوراں،، سے ہوا ۔ آج کل وہ ریڈیو پاکستان کے رسالہ ”آہنگ،، کے مدیر ہیں ۔ غلام عباس نے ”آنندی،، لکھ کر اردو ادب میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے ۔

غلام عباس کے افسانوں میں یکسانی نہیں ہوتی ، ان کے ہاں خاصا تنوع ہے ۔ ان کے یہاں نفسیاتی حقائق نظر آتے ہیں ۔ وہ ہماری معاشرتی زندگی کو نہ کریدتے ہیں اور نہ مصلح بن کر اپنے نظریات منواتے ہیں ۔ ان کے یہاں وہ کہانیاں ہوتی ہیں جن کے کردار نیک اور اچھے کام کرتے رہتے ہیں ۔ جہاں ان کرداروں میں ایک نامعلوم سی مجرمانہ خواہش ابھرتی رہتی ہے ، وہیں ان کے عقائد و خیالات میں ایک خاص کش مکش نظر آتی ہے ۔ بشری کمزوری اور بشری قوت ضمیر کی یہ ہنگامہ آرائی ہماری زندگی سے کتنی ملتی جلتی ہے اور ان کی اصلاح کیوں کر ممکن ہے ، غلام عباس اس کو ناظرین پر چھوڑتے ہیں ۔ آن کی طرز تحریر صاف اور رواں ہوتی ہے ۔

# دو تماشے

مرزا برجیس قدر کو میں ایک عرصہ سے جانتا تھا - ہر چند ہماری طبیعتوں اور ہماری سماجی حیثیتوں میں بڑا فرق تھا ، پھر بھی ہم دونوں دوست تھے - مرزا کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو کسی زمانے میں بہت معزز اور متمول سمجھا جاتا تھا مگر اس کی حالت اس پرانے تناور درخت کی سی ہوگئی تھی جو اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر ایک دن اچانک زمین پر آرہتا ہے -

مرزا کو اپنے خاندان کے اس زوال کا پورا احساس تھا مگر اس کو روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی - البتہ جہاں تک ظاہری رکھ رکھاؤ کا تعلق تھا مرزا اس میں ذرا سی کوتاہی بھی نہ ہونے دیتا تھا - اس کے دل میں نہ جانے کیوں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ خاندان کا وقار قائم رکھنے کے لیے درشت مزاجی اور تحکم لازمی ہیں - اس خیال نے اسے سخت دل بنا دیا تھا ، مگر یہ درشتی اور سختی اوپر ہی اوپر تھی اندر سے مرزا بڑا نرم تھا اور یہی ہماری دوستی کی بنا تھی -

ایک دن سہ پہر کو میں اور برجیس قدر انار کلی میں شاندار موٹر میں بیٹھے جوتے والے کی دکان سے سلیم شاہی جوتا خرید رہے تھے - مرزا نے اپنا ٹھاٹھ دکھانے کے لیے یہ ضروری سمجھا تھا کہ موٹر میں بیٹھے بیٹھے دکان کے مالک کو پکارے اور جوتے

اپنی موٹر ہی میں ملاحظہ کرے ۔ شہر میں ابھی مرزا کی ساکھ قائم تھی ، اور دکاندار عام طور پر اس کی ان اداؤں کو سہنے کے عادی تھے ۔ چناں چہ جوتے والے نے اپنے دو کارندے مرزا کی خدمت پر مامور کر دیے ۔

مگر مرزا کو کوئی جوتا پسند نہیں آرہا تھا اور وہ بار بار ناک بھوں چڑھا کر ان کارندوں کو سخت و سست کہہ رہا تھا ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مرزا کو دراصل جوتے کی ضرورت ہی نہیں اور یہ جھوٹ موٹ کی خریداری محض بھرم رکھنے کے لیے ہے ۔

عین اس وقت ایک بڈھا بھکاری ایک پانچ سالہ لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھے مرزا کی موٹر کے پاس آکھڑا ہوا ۔ یہ بڈھا اندھا تھا ، لڑکی کے بالوں میں تنکے الجھے ہوئے تھے ۔ معلوم ہوتا تھا مدت سے کنگھی نہیں کی گئی ۔ دونوں کے تن پر چیتھڑے لگے تھے ۔

" اندھے پر ترس کھاؤ رے بابا ۔" بڈھے نے ہانک لگائی ۔

" بابو جی میں بھوکی ہوں ، پیسہ دو ۔ "لڑکی نے لجاجت سے کہا ۔

مرزا نے ان لوگوں کی طرف توجہ نہ کی ۔ وہ بدستور جوتوں پر تنقید کرتا رہا ۔

اندھے فقیر اور لڑکی نے اپنا سوال دہرایا ۔ اس پر مرزا نے ایک نگاہ غلط انداز ان پر ڈالی اور کہا " معاف کرو ، معاف کرو ۔"

بھکاری اب بھی نہ ٹلے ۔

" بابو جی رات سے کچھ نہیں کھایا ہے ۔" اندھے نے کہا ۔

" بابو جی بڑی بھوک لگ رہی ہے ۔ پیٹ میں کچھ نہیں

ہے ، لو دیکھو۔" بچی نے کہا اور جھٹ میلا کچیلا کرتا اٹھا کر اپنا پیٹ دکھانے لگی ۔ لاغری سے بچی کی پسلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں اور گنی جاسکتی تھیں ۔ " بس ایک پیسے کے چنے بابو جی ۔"

مرزا کو اس لڑکی کا میلا میلا پیٹ دیکھ کر گھن سی آئی۔ " توبہ ، توبہ " اس نے بیزاری کے لہجے میں کہا " بھیک مانگنے کے لیے کیا ڈھونگ رچائے جاتے ہیں۔ جاؤ جاؤ بابا ۔ خدا کے لیے معاف کرو ۔"

مگر فقیر اب بھی نہ گئے ۔ قریب تھا کہ مرزا غصے سے بھنا جاتا ، مگر یہ تماشا اسی طرح ختم ہوگیا کہ مرزا کو اس دکاندار کا کوئی جوتا پسند نہ آیا اور وہ اپنی موٹر کو وہاں سے بڑھا لے گیا ۔

اس واقعہ کے چند روز بعد میں اور مرزا برجیس قدر شہر کے ایک بڑے سنیما میں ایک دیسی فلم دیکھ رہے تھے ۔ فلم بہت گھٹیا تھی ، اس میں بڑے نقص تھے مگر ہیروئن میں بڑی چٹک مٹک تھی اور وہ گاتی بھی خوب تھی ۔ اس نے فلم کے بہت سے عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا ۔ کہانی بڑی دقیانوسی تھی ۔ اس میں ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ بنک کے ایک چپراسی کو اس الزام میں کہ اس نے بنک لوٹنے میں چوروں کی مدد کی ، پانچ سال قید کی سزا ہو جاتی ہے ۔ اس چپراسی کی بیوی مرچکی ہے مگر اس کا ایک چار سالہ بیٹا ہے جو اپنی بوڑھی دادی کے پاس رہتا ہے ۔ چپراسی کے قید ہو جانے پر یہ دادی پوتا بھوکوں مرنے لگتے ہیں ۔ ادھر کوٹھڑی کا کرایہ نہ ملنے پر مالک مکان انھیں گھر سے نکال دیتا ہے ۔ بڑھیا پوتے کا ہاتھ پکڑ کر بازار

میں بھیک مانگنے لگتی ہے۔ وہ ہر راہ گیر سے کہتی ہے۔

"بابو جی ہم بھوکے۔"

"ایک پیسے کے چنے لے دو۔ بابو جی۔" لڑکا کہتا ہے۔

جب فلم اس مقام پر پہنچی تو مرزا برجیس قدر نے اندھیرے میں مجھ سے کہا۔

"بھیا ذرا اپنا رومال تو دینا۔ نجانے میرا کہاں گر گیا۔"

میں نے اپنا رومال دے دیا۔ جب تک تماشہ ہوتا رہا میں نے مرزا کو سخت بے چین دیکھا۔ وہ بار بار کرسی پر پہلو بدلتا اور ہاتھ چہرے تک لے جاتا۔ خدا خدا کرکے فلم ختم ہوئی تو میں نے دیکھا وہ جلدی جلدی آنکھیں پونچھ رہا ہے۔

"ایں مرزا صاحب!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "آپ رو رہے تھے؟"

"نہیں تو" مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "آنکھوں کو ذرا سگریٹ کا دھواں لگ گیا تھا...... اور بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سرکار ایسے دردناک فلم دکھانے کی اجازت کیوں دیتی ہے۔"

# کرشن چندر

کرشن چندر ریاست پونچھ (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں تعلیم حاصل کی اور یہیں سے ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی پاس کیا مگر وکالت نہیں شروع کی۔ کچھ عرصہ لکھنؤ اور دہلی ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد پونہ چلے گئے اور شالیمار اسٹوڈیو میں کہانی لکھنے پر مقرر ہوئے۔ اس وقت بمبئی ہی میں مقیم ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں تخیل اور حقیقت پسندی کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ ان کے انداز بیان میں شاعرانہ حسن ہے جو کبھی کبھی حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں میں بڑا تنوع ہے۔ انھوں نے کئی ناول بھی لکھے ہیں جن میں "شکست" کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

کرشن چندر کے پہلو میں ایک دردمند اور حساس دل ہے۔ کشمیر کی جنت نظیر وادیوں کے دل فریب مناظر اور حسن فطرت کی گود میں پروان چڑھے ہوئے حسن نے ان کو ایک رومانی لذت و سرور کا حامل بنا دیا ہے۔

بقول وقار عظیم صاحب اُن کے یہاں ہر ٹیس کے پس منظر میں پہلے حسن فطرت ہے اور پھر اس کے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے جرم و گناہ۔ سفیدی میں

سیاہی ، اجالے میں اندھیرا ، یہ سب دیکھ کر انھیں جہاں کچھ افراد پر ترس آتا ہے ، وہاں کچھ افراد پر غصہ بھی آتا ہے ، لیکن سب سے زیادہ غصہ آن کے دل میں اس دھوکے کے خلاف بھرا ہوا ہے جو ہماری دنیا میں تہذیب اور انسانیت کے نام سے پھیلا ہوا ہے -

کرشن چندر کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا کبھی نہ تھکنے اور تھکانے والا انداز ہے ۔ آن کے پاس ہر بات کے کہنے کا ایسا طریقہ ہے جو سیدھا دل پر اثر کرتا ہے -

اردو میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری ، انداز اور فکر میں تدریجی ترقی اور پختگی کی سب سے اچھی مثال ہے - یہاں ہر چیز ایک خاص جگہ سے شروع ہوکر اپنے راستے بدلتی اور ایک نیا اور پہلے سے بہتر نہج اختیار کرتی رہی ہے - یہاں تک کہ اعتماد اور بھروسے نے اسے ایک منزل تک پہنچا دیا جو اس کی اپنی منزل ہے -

کرشن چندر اپنی فنی کائنات کے جز و کل پر پوری طرح قادر ہیں -

# موہنجو ڈارو کا خزانہ

(۱)

موہنجوڈارو کے سب ٹیلے کھودے جا چکے تھے ، سوائے ایک ٹیلے کے۔

موہنجوڈارو کے ٹیلوں کا سینہ چیر کے انسانی ہاتھوں نے پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کے سارے عناصر سمیٹ لیے تھے --

کتبے ، صراحیاں ، کھلونے ، حمام ، چکیاں ، اصطبل ، فصیلیں ، حصار ، گودام ، غلام گردشیں (غلام ہمیشہ گردش میں رہتے ہیں۔ آج بھی اور آج سے پانچ ہزار سال پہلے بھی) کپڑا ، رنگ ، ظروف ، مٹی کے تابوت ، وزن کے سیر ، پاؤ ، چھٹانک ۔ کھودنے والوں نے سب کچھ نکال لیا تھا مگر جو وہ چاہتے تھے وہ انھیں نہیں ملا ۔

کھودنے میں کامیابی یا ناکامی دونوں ممکن ہیں ۔ زمین کھودنے پر اپنے سارے خزانے اگل دیتی ہے لیکن کبھی کبھی انسان اپنی خواہشوں کو اس میں سے کھودتا ہے اور نا کام رہتا ہے ، اور پھر زمین کو گالی دیتا ہے ۔ اس میں زمین کا کیا قصور؟

یوں تو زمین نے انسان کی ہر خواہش کو پورا کیا ہے ، لیکن اپنے طریقے سے ۔

کیوں کہ زمین ایک عشوہ طراز محبوبہ ہے ! لیکن بہت سے

لوگ اسے محض مٹی سمجھتے ہیں ! اور اس طرح اپنی خواہش کو مٹی میں ملا دیتے ہیں -

(۲)

انجینیروں اور محکمہ آثار قدیمہ کے ماہروں کی کانفرنس جاری تھی - ایک گنجے سر والا یورپین تھا ڈیوڈ ، یورپین اور فلاسفر اور یہودی - دوسرا سانولے رنگ کا دبلا پتلا مسلمان تھا ، اطہر - اسے ہر وقت مٹی کے کتبے جمع کرنے کا شوق تھا - اگر مٹی کے ڈھیر سے نکالتے وقت کوئی کتبہ یا حروف کی مہر یا اینٹ بیچ میں سے ٹوٹ جاتی تو وہ ایسے آبدیدہ ہو جاتا جیسے کسی نے اس کے دل پر پاؤں رکھ دیا ہو - تیسرا موجمدار ، ایک بنگالی ہندو تھا - سیاہ فام اور کوتاہ قد ، لیکن اپنے ذہن میں علم و فضل کے سمندر سمیٹے ہوئے تھا - مصر کا آخری اہرام اس کے سامنے ہی کھولا گیا تھا - فرات کی وادیوں میں نینوا کی ملکہ بت اسی نے دریافت کیا تھا - چوتھا میں تھا - میں جو ماضی کا پچھتاوا ہوں اور مستقبل کی باز گشت - لیکن وہ مجھے صرف سن سکتے تھے ، دیکھ نہیں سکتے تھے -

موجمدار نے کہا ”اب صرف آخری ٹیلہ رہ گیا ہے کھودنے کے لیے ، سمجھ میں نہیں آتا ، اتنے بڑے شہر کے خزانے کو کیا ہوا - عورتوں کے سونے کے زیور تو کہیں کہیں ملے ہیں مگر بے حد معمولی - ان میں سے کسی میں ہیرے یا جواہرات بھی ٹکے ہوئے ہیں لیکن بے حد معمولی اور جھوٹے اور گھٹیا قسم کے - اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں سونا دریافت ہو چکا تھا اور ہیرے اور جواہرات بھی - پھر شہر کا خزانہ کدھر گیا ؟

میں نے کہا: "ہو سکتا ہے اپنے وقت کا کوئی نادر شاہ اس زمانہ میں بھی رہا ہو۔ وہ اس شہر کے سارے خزانے لوٹ کر چلتا بنا ہو!"

لیکن ان لوگوں نے میری بات کی پروا نہ کی۔

اطہر نے کہا: "یہ لاتعداد، ان گنت کتبے ملے ہیں مگر کسی ٹیلے پر سے وہ مہر نہیں ملی جو موہنجوڈارو کی زبان کی کلید ثابت ہوتی۔ . . . . اس کلید کے دریافت نہ ہونے سے ہماری تہذیب دنیا کی سب سے پرانی زبان کے بیش قیمت ورثے سے محروم ہو جائے گی۔" میں نے کہا: "مردہ زبانوں کو ڈھونڈنے والے، آج تیرے سامنے جو زندہ زبانوں کو قتل کیا جا رہا ہے، اس کے بارے میں تیری کیا رائے ہے۔"

لیکن اطہر نے اس طرح اپنا کندھا ہلا دیا جیسے اس نے میری بات ہی نہ سنی ہو۔

ڈیوڈ بولا: "خزانہ نہ ملے مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ آخر کون سا یہ خزانہ ہم اپنے گھر لے جا سکیں گے۔ زبان کی کنجی بھی نہیں ملتی، نہ ملے۔ آخر یہ زبان آج کل کے زمانے کے کس کام کی؟ ہم اپنے بچوں کو اس زبان میں تعلیم دینے سے تو رہے! مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے ٹیلے ہم نے کھود ڈالے، سارے موہنجوڈارو کی بنیادیں تک ہم نے ہلا دیں لیکن آج تک وہ مٹی کا خدا نہ ملا جسے وہ لوگ پوجتے تھے۔ ہر تہذیب کے لیے کسی نہ کسی خدا کا تصور ضرور ہوتا ہے۔ موہنجوڈارو کے لوگ کس خدا کو پوجتے تھے، یہ راز کسی ٹیلے کے کھودنے سے ہم پر ظاہر نہ ہوا۔"

میں نے کہا: "شاید اس راز کو ڈھونڈنے کے لیے تمھیں

کسی ٹیلے کو کھودنے کی ضرورت نہ تھی۔ ذرا سا اپنے دل کو کھود لیتے۔"

ڈیوڈ نے غصہ سے سامنے کی دیوار کی طرف دیکھا جہاں اس کے خیال میں، میں مکڑی کے ایک جالے سے لٹکا ہوا تھا۔ پھر اس نے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی۔ باہر ایک نیم ریتیلے میدان میں ایک بوڑھا گڈریا بھیڑیں چرا رہا تھا۔

ڈیوڈ نے کہا: "ایک روز یہ بوڑھا گڈریا مجھ سے کہتا تھا کہ موہنجوڈارو کا سب سے بیش قیمت خزانہ اس ٹیلے میں دفن ہے۔"

میں نے پوچھا: "اس ٹیلے میں جو اب تک کھودا نہیں گیا؟"

کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ سب اپنے اپنے خوابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

ڈیوڈ نے کہا: "کل رات کو ہم تینوں مل کر موہنجوڈارو کے آخری ٹیلے کو کھودیں گے۔ جب مزدور کام کرکے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے اس میں سے... ؟"

اطہر بولا: "شاید موہنجوڈارو کی زبان کی کنجی مل جائے!"

موجمدار بولا: "شاید موہنجوڈارو کا خزانہ مل جائے!"

ڈیوڈ بولا: "شاید موہنجوڈارو کا خدا مل جائے!"

تینوں نے مل کر اس اونچے ٹیلے کی طرف دیکھا جس کے سایوں میں وہ گڈریا بکریاں چرا رہا تھا۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گڈریا مسکرا رہا ہے۔

## (۳)

رات کے تیسرے پہر تک وہ لوگ تینوں مل کر زمین کھودتے رہے۔ زمین بھربھری ریتیلی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

کہ جتنا اونچا ٹیلہ ہوتا ہے اتنا ہی بھس بھرا ہوتا ہے کیوں کہ اب تک اس ٹیلے میں سے کام کی کوئی چیز نہ نکلی تھی۔ مٹی کا ایک کتبہ، بچوں کا ایک کھلونا، عورتوں کا ایک زیور، موت کا ایک تابوت۔ کچھ بھی تو اس ٹیلے سے نہ نکلا۔ بس ریت ہی ریت تھی۔

"وہ گڈریا بکواس کرتا تھا۔" ڈیوڈ نے جھلا کر کہا۔

موجمدار نے کہا: "قیمتی چیز سب سے اخیر میں ملتی ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے نا! سب سے بیش قیمت شے سب سے محفوظ جگہ چھپا کر رکھتا ہے۔"

"اب ہم ٹیلے کے آخر تک آن پہنچے ہیں۔" اطہر نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کمر سیدھی کرتے ہوئے کہا "مگر اب تک ریت کے سوا اس میں سے کچھ نہیں ملا۔" اس کے لہجے میں بڑی مایوسی تھی۔

میں نے کہا: "مگر پانچ ہزار سال پرانی ریت کو تو دیکھو۔ اس کے ذرے ذرے میں کتنی پرانی کہانیوں کی مہک ہے......... اس سے کانچ کی چوڑی بنی تھی جسے موہنجو ڈارو کی عورت نے اپنی نازک کلائی میں پہنا تھا۔ اس ریت میں موہنجو ڈارو کے بچوں نے مٹی کے گھروندے بنائے تھے۔ اس ریت میں آج سے پانچ ہزار برس پہلے کسی عاشق کا تابوت گاڑا گیا تھا۔ ذرا سونگھو تو اس ریت کو۔ سنو یہ پانچ ہزار برس پرانی مہک کیا کہتی ہے؟ کیا سناتی ہے؟ کس کس طرح فریاد کرتی ہے؟"

عین اس وقت موجمدار کی کدال دھات کے کسی برتن سے ٹکرائی اور موجمدار کدال چھوڑ کر وہیں دھم سے بیٹھ گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"سنبھال کے، سنبھال کے"، ڈیوڈ نے اسے تہدیدی انداز میں کہا اور خود بھی موجمدار کے قریب بیٹھ گیا۔

تیسری طرف سے اطہر بھی آکے ان کے سامنے بیٹھ گیا

چوتھی طرف میں بیٹھا تھا لیکن وہ مجھے دیکھ نہ سکتے تھے۔ صرف میرے قریب رکھے ہوئے گیس لیمپ کی اُجلی اجلی روشنی دیکھ سکتے تھے۔

ان تینوں نے ہاتھوں سے بلکہ ناخنوں سے کرید کرید کر دھات کے اس برتن کو نکالا۔ ڈیوڈ نے جھاڑ پونچھ کر اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر گیس کی روشنی میں دیکھا۔

موجمدار خوشی سے چلا کر بولا: "یہ تو سونے کی صندوقچی ہے!"

واقعی یہ سونے کی ایک خوب صورت صندوقچی تھی جس پر خب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور موہنجو ڈارو کی قدیم زبان کے حروف کندہ تھے اور عجیب و غریب دیوی دیوتاؤں کی تصویریں کھدی تھیں۔

موجمدار نے چلا کر کہا: "یہی وہ ہے موہنجو ڈارو کے شہر کا بیش قیمت خزانہ۔ یاقوت، نیلم، مرجان سے بھرا ہوا۔"

اطہر بولا: "اس میں موہنجو ڈارو کی زبان کی کنجی ہے! یہ باہر کے کندہ کیے گئے حروف تو دیکھو۔"

ڈیوڈ بولا: "اس میں موہنجو ڈارو کا خدا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کی عجیب و غریب تصویریں اس مقدس صندوقچی کی حفاظت کر رہی ہیں یہ دیکھو — یہ دیکھو۔"

"کھولو، کھولو۔" موجمدار نے بڑی بے تابی سے کہا۔ "اس صندوقچی کو جلدی سے کھولو۔"

صندوقچی میں تالا بھی سونے کا لگا ہوا تھا۔ لیکن ڈیوڈ کو تالا کھولنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ محکمۂ آثار قدیمہ کے ماہروں اور نقب زنوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ تکنیک کے اعتبار سے دونوں میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس لیے تالا بہت جلدی کھول لیا گیا۔

لیکن ڈیوڈ کا دل ڈھکنے کو کھولنے سے ہچکچا رہا تھا۔ آخری لمحوں میں ہمیشہ یونہی ہوتا ہے اور بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تھیٹر کا پردہ اٹھنے والا ہو۔

موجمدار نے کہا: "ڈھکنا اٹھاؤ۔ ڈیوڈ جلدی سے ڈھکنا اٹھاؤ۔" ڈیوڈ پھر ہچکچایا۔

اطہر نے آگے بڑھ کے صندوقچی کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ "خدا کے لیے ڈیوڈ۔"

اندر ایک گول سیاہ سی چیز پڑی تھی۔ ڈیوڈ نے اسے بڑی احتیاط سے اٹھایا۔ سونگھا اور پھر بڑی مایوسی سے کہا۔ "ارے! یہ تو ایک روٹی ہے — !"

"روٹی"، موجمدار مایوسی سے چلایا۔

میں نے کہا۔ "ہاں روٹی دنیا کا سب سے بیش قیمت خزانہ۔"

اطہر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "روٹی ؟"

میں نے کہا: "روٹی جو ہر زبان کی کنجی ہے۔"

ڈیوڈ کا سر ناامیدی سے اپنے سینے پر جھک گیا۔ وہ آہستہ سے بولا: "صرف ایک روٹی ؟"

میں نے کہا: "روٹی! جو ساری تہذیبوں کا خدا ہے!"

لیکن امید و بیم کی پہلی کش مکش میں میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی - ان تینوں نے باری باری سے اس روٹی کو اٹھا کر دیکھا - ہاں روٹی تھی - اناج کی روٹی تھی - آگ پر پکی ہوئی روٹی تھی اور — صرف ایک روٹی تھی -

ڈیوڈ نے اس روٹی کو ہاتھ میں لیا اور غصے سے بولا: "کدھر ہے وہ گڈریا جو کہتا تھا ، موہنجو ڈارو کے آخری ٹیلے میں اس کا سب سے بیش قیمت خزانہ دفن ہے ؟"

تینوں نے مل کر اس سمت دیکھا جدھر گڈریا بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا - مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گڈریا مسکرا رہا ہو - پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رو رہا ہو ، اس روٹی کے لیے جو انسان کی پہلی خوشی ہے اور اس کا آخری غم ہے - پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے جہاں پر گڈریا تھا وہاں پر اب صرف ایک صلیب ہے -

پھر یکایک صلیب کے پیچھے سے آفتاب نکل آیا اور اس کی سنہری کرنوں میں وہ روٹی یکایک سونے کے ایک تھال کی طرح چمک اٹھی اور یکایک ان تینوں کی سمجھ میں آگیا اور موجمدار نے ڈیوڈ سے کچھ اشارہ کر کے کہا :

"اس روٹی کو چھپا لو - اس روٹی کو چھپا لو - مزدور کام پر واپس آرہے ہیں -"

ڈیوڈ نے گھبرا کر جلدی سے اپنے دامن میں چھپا لیا اور افق کی طرف دیکھا -

افق پر واقعی صبح ہوچکی تھی اور مزدور کدالیں اٹھائے اپنے کام پر واپس آرہے تھے -

# خواجہ حسن نظامی

آپ کا نام علی حسن مگر مشہور نام حسن نظامی تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے نسبت رکھتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ سے بھی وابستہ رہے۔ آپ کی طبیعت میں سجادہ نشینی کے خصائل نظر آتے ہیں۔ آپ ۲ محرم ۱۲۹۶ھ کو پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی تعلیم کے حصول کے بعد انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے مگر شدبد کے سوا اس میں کوئی ترقی نہیں کی۔

ادب اور لکھنے لکھانے کا شوق اس طرح ہوا کہ ایک بار ایک اخبار اُن کی نظر سے گزرا۔ اُس کے مضامین پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور خود بھی لکھنا شروع کر دیا۔ یہ شوق اتنا بڑھا کہ بارہ سال کے عرصے میں چالیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔ شروع ہی سے صوفیانہ ماحول ملا تھا۔ اس لیے خواجہ صاحب خود بھی صوفی ہوئے اور ہندوستان میں بہت سے لوگ آپ کے مرید ہوئے۔ آپ ہندوؤں کو بھی مرید کیا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب کی پہلی تصنیف "مفلسی کا مجرب علاج" ہے۔ آپ کی نثر سادگی اور پرکاری کا بہترین مرقع ہے۔ خیال سے خیال اور بات سے بات پیدا کرتے

ہیں ۔ روانی اور سلاست ان کی تحریر کے خاص جوہر ہیں ۔ یہ رنگ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات بیان کرنے میں نمایاں ہے ۔ اس کی وجہ سے خواجہ صاحب پڑھنے والے پر ایک خاص کیفیت طاری کر دیتے ہیں ۔ آپ کا شمار صاحب طرز انشا پردازوں میں ہوتا ہے ۔

خواجہ حسن نظامی نے معمولی سے معمولی عنوانات پر اپنا قلم اٹھایا اور انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ ۔ مثلاً جھینگر ، دیا سلائی ، منکہ ایک دھوبی ہوں ، ایک پیسہ کا سفرنامہ اور اوس وغیرہ ۔ ان سے ان کی جزئیات نگاری اور کافی مطالعہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔

# شہزادی کی بپتا

ہونے کو تو غدر ۱ پچاس برس کی کہانی ہے مگر مجھ سے پوچھو تو کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان دنوں میری عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ میں اپنے بھائی یاور شاہ سے دو برس چھوٹی اور مرنے والی بہن ناز بانو سے چھ سال بڑی ہوں۔ میرا نام سلطان بانو ہے۔ ابا جان مرزا قریش بہادر ظل سبحانی حضرت بہادر شاہ کے چہیتے اور ہونہار فرزند تھے۔

بھائی یاور شاہ اور ہم بہنوں میں بڑی محبت تھی۔ بس ایک دوسرے پر فدا تھا۔ آکا بھائی کے لیے باہر کئی استاد طرح طرح کی باتیں سکھانے والے رہتے تھے۔ کوئی حافظ تھا اور کوئی مولوی، کوئی خوش نویس تھا اور کوئی تیر انداز۔

ہم محل کے اندر سینا پرونا اور کشیدہ کاڑھنا، مغلانیوں ۲ سے سیکھتے تھے۔ دستور تھا کہ حضرت ظل سبحانی جن بچوں اور بڑوں پر خاص نظر عنایت رکھتے تھے ان کو صبح کا کھانا شاہی دسترخوان

---

۱ - غدر، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جس میں ہندو اور مسلمان مل کر انگریزوں کو اپنے ملک سے نکالنا چاہتے تھے۔ غدر کا مفہوم افراتفری ہے جب کہ قانون کی پابندی ختم ہو گئی ہو، بلوہ۔ انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا ہے۔

۲ - مغلانیاں :- مغل نام ایک قوم کا ہے جو اعلیٰ قوم ترکستان کی ہے۔ مغلانیوں کے معنی مغلوں کی اہلیہ کے ہیں مگر یہاں پر مراد وہ مغل سہیلیاں ور اصیلیں ہیں جو شاہی قلعہ میں رہتی تھیں۔ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر مامور ہوتی تھیں۔

پر حضور والا کے ہمراہ کھلایا جاتا تھا۔ چناں چہ ظل سبحانی مجھ کو بھی بہت چاہتے تھے اور میں ہمیشہ صبح کے وقت کھانے کے واسطے بلائی جاتی تھی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور چچا ابوبکر کے لڑکے مرزا سہراب سے میری نسبت ٹھہر گئی تو حضور کے دسترخوان پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی کیوں کہ وہاں مرزا سہراب بھی کھانا کھانے آیا کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے کل خاندان میں باہم پردہ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ شرعی نامحرم ۱ گھر میں آتے جاتے تھے مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور تھی۔ مجھے ایک آن کے لیے کسی غیر مرد کے سامنے جانا گوارا نہ تھا۔ پر کیا کرتی حضور کے حکم کے خلاف دسترخوان پر کس طرح نہ جاتی۔ اول تو آداب سلطانی کے باعث ہم سب نظریں جھکائے رکھتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ ایک بچہ بھی ادھر اُدھر دیکھے یا آواز سے بولے۔ سب چپ چاپ مجرا ۲ عرض کرکے اپنے قرینے سے بیٹھ جاتے تھے۔ قاعدہ تھا کہ جب حضور معلیٰ کوئی خاص کھانا کسی کو مرحمت فرماتے تو وہ بچہ ہو یا جوان عورت ہو یا مرد ، اپنی جگہ سے اُٹھ کر جائے ادب سے جاتا اور جھک کر تین سلام بجالاتا۔ ایک دن میرے ساتھ بھی یہی اتفاق پیش آیا کہ حضور نے ایک نئی قسم کا ایرانی کھانا مجھ کو عطا کیا اور فرمایا "سلطانہ۔ سلطانہ! تو تو کچھ کھاتی ہی نہیں ، ادب و لحاظ ایک حد تک اچھا ہوتا ہے ، نہ کہ اتنا کہ دسترخوان سے بھوکا اُٹھا جائے۔" میں کھڑی ہوئی اور جائے ادب پر جاکر تین آداب بجا لائی مگر کچھ نہ پوچھو اس مشکل سے آئی گئی کہ دل ہی جانتا ہے۔ ہر قدم پر الجھتی تھی اور اوسان خطا ہو جاتے تھے۔

---

۱۔ نامحرم : وہ مرد جن سے عورتوں کو شرعاً پردہ کرنا چاہیے۔

۲۔ مجرا : آداب بجالانا

اب میں سوچتی ہوں کہ وہ زمانہ کیا ہوا ، وہ خوشی کے دن کہاں چلے گئے جب ہم اپنے محلوں میں آزاد اور بے فکر پھرا کرتے تھے - ظل سبحانی کا سایہ سر پر تھا اور لوگ ہمیں ''ملکہ عالم'' کہہ کر پکارتے تھے - دنیا کے آثار چڑھاؤ ایسے ہی ہوتے ہیں-

مجھے خوب یاد ہے کہ جب حضور معلیٰ مقبرہ حضرت ہمایوں میں گرفتار کیے گئے تو ایک خواجہ سرا آیا اور کہنے لگا ، '' بیگم یہاں کیوں کھڑی ہو، چلو تمھارے ابا جان نے بلایا ہے -'' میں اسی بے خودی کی حالت میں اس کے ساتھ ہو لی - دریائی دروازے سے اتر کر دیکھا کہ ابا جان مرزا قریش بہادر گھوڑے پر سوار ننگے سر موجود ہیں- تمام چہرے اور سر کے بال خاک آلودہ ہو رہے ہیں - مجھے دیکھتے ہی آنسو بھر لائے اور فرمایا '' لو سلطانہ ! اب ہمارا بھی کوچ ہے - جوان بیٹا جس کے سہرے کی آرزو تھی آنکھوں کے سامنے سنگین کی سپر بن گیا -'' یہ سنتے ہی میں نے ایک چیخ ماری اور ہائے بھائی یاور'' کہہ کر رونے لگی - وہ گھوڑے سے اتر آئے - مجھ کو اور ناز بانو کو گلے لگا کر پیار اور تسلی کرنے لگے اور کہا '' بیٹی ! اب لوگ میری تلاش میں ہیں- میں بھی دو چار گھڑی کا مہمان ہوں - تم ماشاء اللہ جوان اور سمجھدار ہو ، اپنی چھوٹی بہن کو دلاسا دو اور خود آنے والی مصیبتوں پر صبر کرو - خبر نہیں اس کے بعد کیا پیش آنے والا ہے - جی تو نہیں چاہتا کہ تم کو تن تنہا چھوڑ کر کہیں جاؤں پر ایک نہ ایک دن تم کو بن باپ کا بننا پڑے گا - ناز بانو ابھی بچہ ہے اس کی دلداری کرنا اور نیکی سے زندگی بسر کرنا - اور دیکھو ناز بانو ! اب تم شہزادی نہیں ہو ،کسی چیز کے لیے ضد نہ کرنا اور جو میسر آئے شکر کر کے کھالینا - اگر کوئی شخص کھاتا ہو تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا ورنہ لوگ کہیں گے کہ شہزادیاں

بڑی بد نیت ہوتی ہیں - " پھر ہم دونوں کو خواجہ سرا کے سپرد کر کے کہا کہ ان کو جہاں ہمارے خاندان کے اور آدمی ہوں پہنچا دینا - اس کے بعد ہم کو پیار کیا اور روتے ہوئے گھوڑا دوڑاتے جنگل میں گھس گئے - پھر پتا نہ لگا وہ کیا ہوئے - خواجہ سرا ہم کو لے چلا - یہ ہمارے گھر کا قدیمی نمک خوار تھا - تھوڑی دور تک ناز بانو جو نازوں کی پلی ہوئی تھی چلی مگر پھر پاؤں کی طاقت نے جواب دے دیا اور دو قدم چلنا دو بھر ہو گیا - مجھ کو بھی کبھی پیدل چلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی تھی مگر بانو کو لیے ہوئے چلی جاتی تھی - اتنے میں ناز بانو کے ایک نوک دار کانٹا چبھ گیا اور وہ ہائے کہہ کر گر پڑی - میں نے جلدی سے اس کو اٹھایا اور کانٹا نکالنے لگی - مگر موا خواجہ سرا کھڑا دیکھا کیا اور یہ نہ ہوا میرا ہاتھ بٹا لیتا بلکہ چلنے کی جلدی کرنے لگا - بہن بولی " آپا جان مجھ سے پیدل نہیں چلا جاتا - ناظر کو بھیج کر گھر سے پالکی منگالو - " گھر اور پالکی کا نام سن کر میرا جی بھر آیا اور اس کو تسلی دینے لگی - خواجہ سرا نے پھر کہا کہ چلو بس ہو چکا چلو ! ناز بانو کا مزاج تیز تھا، وہ نوکروں کو ہمیشہ سخت سست کہہ لیا کرتی تھی اور یہ لوگ دم بخود ہو کر سن لیتے تھے - اسی خیال سے اس نے خواجہ سرا کو پھر دو ایک باتیں سنا دیں - کمبخت کو سنتے ہی اتنا غصہ آیا کہ آپے سے باہر ہو گیا اور بڑی بے ترسی سے بن باپ کی دکھیا بچی کے ایک طمانچہ مارا - بانو بلبلا گئی - وہ کبھی پھول کی چھڑی سے نہ پٹی تھی یا اب ایسا طمانچہ لگا - اس کے رونے سے مجھ کو بھی بے اختیار رونا آگیا - ہم تو روتے رہے اور خواجہ سرا کہیں چلا گیا - پھر خبر نہیں موا وہ کیا ہوا - ہم دونوں بمشکل تمام گرتے پڑتے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ پہنچے - یہاں دلی

کے اور خاص ہمارے خاندان کے سیکڑوں آدمی تھے ۔ مگر سب اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار ۔ قیامت کا نمونہ تھا ۔ کسی نے بات تک نہ پوچھی ۔ اسی اثنا میں وبا پھیلی اور پیاری بہن ناز بانو اس میں رخصت ہوگئی ۔ میں اکیلی رہ گئی ۔ امن ہوا جب بھی مجھ دکھیا کو سکھ نہ ملا ۔ آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انگریزی سرکار نے ہم لوگوں کی پرورش کرنا چاہی اور میرا پانچ روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر ہوا جو اب بھی ملتا ہے ۔

(ماخوذ از غدر دہلی کے افسانے)

# احمد ندیم قاسمی

احمد شاہ خاندانی اور احمد ندیم قاسمی ادبی نام ہے - ندیم تخلص کرتے ہیں - مولد موضع انگہ ، تحصیل خوشاب ، ضلع شاہ پور پنجاب ہے ، آپ وہیں ۲۰ نومبر سنہ ۱۹۱٦ء کو پیدا ہوئے -

اجداد مجاہدین عرب کے ساتھ ہندوستان آئے اور ملتان میں رہ کر تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے - بعد میں موجودہ گاؤں انگہ آباد کیا - رفتہ رفتہ یہ خاندان پیری مریدی کی بدولت مشہور ہوا - ندیم صاحب کے والد پیر غلام نبی مرحوم بھی اہل اللہ میں شمار ہوتے تھے -

ندیم صاحب کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی - سنہ ۱۹۲۳ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیااور ان کے حقیقی چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ انہیں سنہ ۱۹۲۵ء میں اپنے ساتھ کیمبل پور لے گئے - پیر صاحب عربی اور فارسی کے عالم اور شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے - چناںچہ انھوں نے بھتیجے میں بھی یہ مذاق پیدا کیا -

سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ نے میٹرک پاس کیا اور ایجرٹن کالج بہاولپور میں داخل ہو گئے - سنہ ۱۹۳۵ء میں آپ

نے بی - اے پاس کیا - سنہ ۱۹۳۹ء میں آپ محکمہ آب کاری میں سب انسپکٹر ہوگئے - یہ ملازمت آپ کے خلاف مزاج تھی ، اس لیے سنہ ۱۹۴۲ء میں اس سے مستعفی ہو گئے سنہ ۱۹۴۲ء سے دارالاشاعت پنجاب لاہور میں "تہذیب نسواں" اور "پھول" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے - اس کے بعد "ادب لطیف" کی ادارت سنبھالی - اس میں ایک مضمون کی وجہ سے ایک مقدمہ میں گرفتار ہوگئے ، مگر بری ہو گئے - تقسیم ملک کے بعد ریڈیو میں ملازم ہوگئے - پھر ہاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر "نقوش" کے ایڈیٹر ہوئے - کچھ عرصہ روزنامہ "امروز" کی ادارت کی خدمات بھی انجام دیں - ان کا کہنا ہے کہ "میں اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کا خود ہی خالق ہوں اور خوش ہوں کہ مجھے اپنا مستقبل روشن و تاباں نظر آتا ہے -" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی شعر و شاعری اور افسانہ نگاری میں اپنی انفرادیت کے سختی سے پابند ہیں اور انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے ذاتی مشاہدات ، احساسات ، تفکر اور اسلوب سے کام لے کر اپنے فن کی پرورش کی ہے -

## پرمیشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے۔ ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی، مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ "کہیں آہی رہا ہوگا۔" کسی نے کہہ دیا۔ "ہزاروں کا قافلہ ہے۔" اور اختر کی ماں اس تسلی کو تھامے پاکستان کی طرف چلی آئی تھی۔ "آہی رہا ہوگا"، وہ سوچتی۔ "کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا اور پھر ماں کو نہ پاکر رویا ہوگا اور پھر..... اب کہیں آرہا ہوگا۔ سمجھ دار ہے۔ پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے۔ آجائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی۔"

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل ادھر یوں ہی بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ[1] گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہر حال جب روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آکر کہا تھا۔ "میں نعرہ تکبیر مار دوں گا۔" ...... اور یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے

---

1 - الگ ہو گیا تھا۔

جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا ۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا ۔ بولا ”ہنسو نہیں یارو ! اس بچے کو بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمھیں اور تمھارے بچے کو پیدا کیا ۔“

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک کرپان نکال لی تھی، بولا ” ذرا ٹھہر پرمیشرے ! کرپان اپنا دھرم پورا کرلے ، پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے ۔“

” مارو نہیں یارو ۔ “ پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی ۔ ”اسے مارو نہیں ، اتنا ذرا سا تو ہے اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے ۔ جس نے .....“

” پوچھ لیتے ہیں —“ ایک اور سکھ بولا ۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا ” بولو ، تمھیں کس نے پیدا کیا . . . خدا نے کہ واہگورو جی نے ؟“

اختر نے اس ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی ۔ آنکھیں جھپک کر اس نے آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے ۔ اس نے پرمیشر سنگھ کو یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے ۔ منہ میں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا ”پتا نہیں ! “

” لو اور سنو ! “ کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا ۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی ۔ بولا ”اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا ۔“

سب سکھ ہنسنے لگے مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے اور پرمیشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا۔ ”سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو میرا کرتار بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔“

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا، بلکتے ہوئے اختر کو پکڑے، وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا ”لے پرمیشرے سنبھال اسے۔ کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتارا بنالے، لے پکڑ۔“

پرمیشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں[1] کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جس نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے آتار کر سکھوں کی طرف لپکا۔ مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے۔ دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی ڈاڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی اور وہ

---

۱۔ بالوں۔

بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آکر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا "نام کیا ہے، تمھارا؟"

"اختر!" اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے!" پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا۔ "ذرا میری انگلیوں میں سے جھانکو تو۔"

اختر ذرا سا جھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کرلی "آہا!" اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا۔ "تتلی!"

"لو گے؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں!" اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔ "لو" پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی اور اختر کی انگلیوں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی۔ اختر اداس ہو گیا اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا "سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو؟ کرتارے کی تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو یونہی منہ لٹکا لیتا تھا۔"

"پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔" نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بیٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا۔ "ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس جائیں گے۔"

پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی، مگر

اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا - پھر جب پرمیشر سنگھ نے کہا کہ "ہاں بیٹے، تمھیں تمھاری اماں پاس ہی لیے چلتا ہوں" تو اختر چپ ہو گیا - صرف کبھی کبھی مسسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے برداشت کرتا جا رہا تھا -

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا - پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا - لٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ ۱ کر دیا تھا - وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چار دیواری میں داخل ہوا تھا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا - اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں اور وہ بڑی پر اسرار سرگوشی میں بولا تھا "یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے -"

گرنتھی جی، اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے - پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انھیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے - "جانے کیا ہو گیا ہے اسے!" اس نے کہا تھا - "واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا اور جب کرتار سنگھ سے بچھڑا تھا تو میں تو خیر رو دھولی، پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا - وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں بھی ذرا غصے سے دیکھ لیتی - بپھر جاتا تھا - کہتا تھا "بیٹی کو برا مت کہو - بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے - یہ تو ایک مسافر ہے بے چاری، ہمارے گھروندے میں سستانے بیٹھ گئی ہے، وقت آئے گا تو چلی جائے گی -" ....... اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا - یہ تک بک دیتا ہے کہ "بیٹیاں، بیویاں اغوا ہوتی

---

۱ - بخش دیا -

سنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔"

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشہ کروٹیں بدلتا، پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اٹھ بیٹھتا۔ بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا۔ "سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!" بیوی اسے محض "اونہہ" سے ٹال کر سو جاتی تھی۔ مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور جب ذرا سی پو پھوٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا اور جب صبح اذان ہوئی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورب سے پھوٹتا اجالا گانے لگا ہے۔

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلاف معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر کو تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پر سے کودتی ہوئی آئی اور بولی۔ "یہ کون ہے؟"

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "ڈرو نہیں، بے وقوف، اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں۔ یہ بھی اپنی ماں کو بھو سے کی کوٹھڑی میں ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے، اس کا نام اختر ہے۔"

"اختر!" بیوی کے تیور بدل گئے۔

"تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا۔" پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی، "اور پھر کیسوں [1] کا کیا ہے، دنوں میں بڑھ آتے ہیں۔ کڑا اور کھچیرا [2] پہنا دو، کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔"

"پر یہ ہے کس کا؟" بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

"کس کا ہے!" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "واہگورو جی کا ہے، ہمارا اپنا ہے۔ اور پھر یارو۔ یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے، کرتارے کے بھی ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا۔ پر ہم اسے یہیں تل پر ہی تو چومتے تھے اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھولوں کی طرح گلابی تو ہیں یارو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں، یہ ذرا پتلی ہیں اور ......"

اختر اب تک مارے حیرت کے بیٹھا تھا "ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا۔ "اری لو۔ یہ اماں پاس جاتا ہے۔"

"تو جائے۔" بیوی کے چہرے اور آنکھوں میں آسیب آ گیا تھا جسے کرتار سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔ "ڈاکہ ڈالنے گیا تھا سورما اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا تو ہزاروں

---

[1] - بالوں [2] - زیر جامہ

میں نہ سہی ایک دو سو میں تو بک جاتی ۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولا بن جاتا اور پھر ...... پگلے ..... تجھے تو کچھ ہو گیا ہے دیکھتے نہیں یہ لڑکا مسلا[1] ہے ۔ جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ اور خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا ۔"

پرمیشر سنگھ نے التجا کی ۔ "کرتارے اور اختر کو بھی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے ، سمجھیں ؟"

"نہیں" اب کے بیوی چیخ اٹھی ۔ "میں نہیں سمجھی اور نہ سمجھنا چاہتی ہوں ، میں رات ہی رات جھٹکا[2] کر ڈالوں گی اس کا ۔ کاٹ کے پھینک دوں گی ۔ اٹھا لایا وہاں سے ۔ لے جا اسے ، پھینک دے باہر ۔"

"تمہیں نہ پھینک دوں باہر ؟" اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا ۔ "تمہارا نہ کر ڈالوں گا جھٹکا ؟" وہ بیوی کی طرف بڑھا اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی ، چیختی ، چلاتی بھاگی ۔ پڑوس سے امر کور دوڑی آئی ۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آگئیں ۔ مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی ۔ پھر اسے سب نے سمجھایا کہ نیک کام ہے ۔ ایک مسلمان کو سکھ بنانا معمولی کام نہیں ۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پرمیشر سنگھ گورو مشہور ہو چکا ہوتا ۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے روتی رہی ۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو ہلا دیا ۔ "اختر کدھر گیا ؟" وہ چنگھاڑا ۔ "ارے وہ کہاں گیا ہمارا

---

۱ ۔ مسلمان ۔

۲ ۔ تلوار سے یک لخت گردن کاٹنا ۔ مراد ہے جان سے مار دوں گی ۔

اختر - ارے وہ تم میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یارو - اختر ، اختر !"

وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا - بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں تھے - عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا - "ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا یارو - ارے وہ گیا کہاں - اختر ! اے اختر !"

"میں تمھارے پاس نہیں آؤں گا -" پگڈنڈی کے ایک موڑ پر گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا - "تم تو سکھ ہو -"

"ہاں بیٹے ، سکھ تو ہوں -" پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعتراف جرم کر لیا -

"تو پھر ہم نہیں آئیں گے -" اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لیے راستہ صاف کیا -

"نہیں آؤ گے ؟" پرمیشر کا لہجہ اچانک بدل گیا -

"نہیں !"

"نہیں آؤ گے ؟"

"نہیں ! نہیں !"

"کیسے نہیں آؤ گے ؟"

"نہیں - نہیں - نہیں -"

"کیسے نہیں آؤ گے ؟" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ مار دیا - "چلو !" وہ کڑکا -

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ، پھر وہ ایکا ایکی زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور گرد اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا۔

" نہیں چلتا۔ بس نہیں چلتا ۔ تم سکھ ہو ۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔میں اپنی اماں کے پاس جاؤں گا ۔ میں تمہیں ماروں گا ۔"

اور جیسے اب پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی ۔ اس کا بھی سارا خون نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دانتوں میں جکڑ لیا ۔اس کے نتھنے پھڑ کنے لگے اور پھر اس زور سے رویا کہ کھیت کی پرلی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹک گئے ۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچوں کی سی آواز میں بولا " مجھے معاف کر دے اختر۔ مجھے تمھارے خدا کی قسم ! میں تمھارا دوست ہوں ۔ تم یہاں سے اکیلے جاؤگے تو تمہیں کوئی مار دے گا اور پھر تمھاری ماں پاکستان سے آکر مجھے مارے گی ۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا ۔ سنا ؟ سن رہے ہو نا ؟ پھر وہاں سے تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا ، کرتارا نام کا ، تو تم اسے وہاں سے ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا ، اچھا ! "

"اچھا ! " اختر نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا ۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر اٹھا لیا اور چلا مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا ۔ سامنے بہت سے بچے اور چند پڑوسی

کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا ”روتے کیوں ہو پرمیشرے۔ کل ایک مہینے کی تو بات ہے۔ ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگے گا۔

کچھ کہے بغیر وہ تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا۔ ”تم کتنے ظالم ہو یارو۔ اختر کو تارا بناتے ہو۔ اور آدھر کوئی تارے کو اختر بنالے تو! اسے ظالم ہی کہو گے نا؟“ پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی۔ ”یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں[۱]۔ میں کل ہی امرتسر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ خالصہ ہوں، سینے میں شیر کا دل رکھا ہے، مرغی کا نہیں۔“

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتوکھ سنگھ اندر آیا اور بولا ”پرمیشر سنگھ۔“

”جی!“ پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

”دیکھو!“ گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا۔ ”کل سے لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا، اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ چھو گئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔ سمجھے؟“

---

۱۔ قسم۔

" جی ! " پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

" ہاں ! " گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی ۔

" ایسا ہی ہوگا ۔ گرنتھی جی ! " پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی " پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے ۔ لگتا ہے پہلے جنم میں یہ مسلا رہ چکا ہے ۔ امر کور بیٹی نے تو جب سے یہ سنا ہے کہ ہمارے گھر میں مسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے ۔ کہتی ہے کہ گھر پر کوئی اور آفت آئے گی ۔ پرمیشرے نے آپ کا کہا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چلی آؤں گی اور امر کور بھی ۔ پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو چاٹے ۔ موا نکما ۔ واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں ۔ "

" واہگورو جی کا لحاظ کون نہیں کرتا ، گدھی ۔ " پرمیشر نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پھر نکالا ۔ پر وہ دیر تک زیر لب گالیاں دیتا رہا ۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آگیا ۔

" اچھا جی ! اچھا " اس نے کہا ۔ اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہوگئے ۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا مشکل ہوگیا ۔ وہی کانوں کی لوؤں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی ، وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کھچیرا ۔ صرف جب وہ گھر میں آکر پگڑی اتارتا تھا تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا ۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ رہے تھے ۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی تھی ۔ " ذرا ادھر آ امر کور ! لے یہ دیکھ ، کیس بن رہے ہیں ۔

پھر ایک دن جوڑا بنے گا ۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا ، کرتار سنگھ ۔ "

" نہیں ماں " امر کور وہیں سے جواب دیتی ۔ " جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے اسی طرح کرتارا بھی ایک ہی ہے ۔ میرا ننھا منا بھائی؟ " وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی ۔ " میں اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی ماں! میں جانتی ہوں ۔ یہ مسلا ہے اور جو کرتارا ہوتا ہے وہ مسلا نہیں ہوتا ۔ "

" میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتارا ہے ۔ میرا چاند سا لاڈلا بچہ ! " پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی ۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں ۔ خوب خوب روتیں ، ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں ۔ وہ اپنے کرتارے کے لیے روتیں ۔ اختر چند روز اپنی ماں کے لیے روتا رہا اب کسی اور بات پر روتا ۔ جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا " میرے سر پر پگڑی باندھو پرموں ! میرے کیس بڑھا دو ۔ مجھے کنگھا خرید دو ۔ "

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا ۔ " یہ سب ہو جائے گا بچے سب کچھ ہو جائے گا ۔ پر ایک بات نہیں ہوگی ، وہ بات کبھی نہیں ہوگی ، وہ نہیں ہوگا مجھ سے ، سمجھے ؟ یہ کیس ویس سب بڑھ جائیں گے ۔ "

اختر اپنی ماں کو اب بہت کم یاد کرتا تھا ۔ جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ

کبھی باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے صرف ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہو - پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی ، اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی - البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ، ناک اچھال دی - شروع شروع میں تو اس نے اختر کو ایک دھموکا بھی جڑ دیا تھا مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بپھر گیا اور امر کور کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیں - اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار پر سے گلی میں پٹخ دیتا - "الو کی پٹھی" اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا -

" سنا تو تھا کہ لڑکیاں اٹھ رہی ہیں پر یہاں یہ مسٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا - عجب اندھیر ہے یارو ! " اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دو چند ہو گئی تھی -

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا - پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی - اختر کو پیاس لگی - " پانی " اس نے کہا - پھر کچھ دیر بعد اس نے لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں - ادھر ادھر دیکھا اور " پانی " کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا - کچھ دیر بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اٹھ بیٹھا - امر کور سامنے

دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔
"پانی دے!" اختر نے اسے ڈانٹا۔امر کور نے بھویں سکیڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جٹ گئی۔ اب کے اختر چلا دیا۔ "پانی دیتی ہے کہ نہیں، پانی دے ورنہ ماروں گا۔" امر کور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ بولی "مار تو سہی، تو کرتارا تو نہیں کہ میں تیری مار سہہ لوں گی۔ میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گی۔" اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اس نے اپنی ماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بری حالت بنا لی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔ "ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امر کور سور کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے امر کور کی طرف غصے سے دیکھا وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی "کیوں پانی پلاؤں؟ کرتارا بھی تو اسی طرح پانی مانگ رہا ہوگا کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر؟ ہاں!"

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی تو تمھاری اماں ہے بیٹے۔"

"نہیں!" اختر بڑے غصے میں بولا۔ "یہ تو سکھ ہے۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔"

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے دیوار سے دے مارا اور چلایا۔ "تمھارے ہاتھ

سے نہیں پئیں گے، تم تو امر کور سور کی بچی کی اماں ہو۔ ہم تو پرموں کے ہاتھ سے پئیں گے۔"

"یہ بھی تو مجھی سور کی بچی کا باپ ہے۔" امر کور نے جل کر کہا۔

"تو ہوا کرے!" اختر بولا۔ "تمھیں اس سے کیا؟"

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا "اری سنتی ہو؟ سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

بیوی نے پہلے تو پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا، پھر ایک دم بڑ بڑا کر اٹھی اور امر کور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے آہستہ سے ہلا کر بولی۔ "بیٹی!"

"کیا ہے ماں؟" امر کور چونک اٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی۔ "سنو تو، سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

یہ ایک ثانیے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امر کور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تر تھی۔

"کیا ہوا بیٹا؟" پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی

کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔ ”ڈر گئے بیٹا۔“

”ہاں!“ اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا۔ ”کوئی چیز چیخی تھی۔“

”امر کور چیخی تھی۔“ پرمیشر سنگھ نے کہا۔ ”ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے۔“

”میں پڑھ رہا تھا۔“ اختر بولا۔

اب کے بھی امر کور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امر کور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر اڑ جائے گا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی۔ ”میں جن ہوں، میں کل رات پھر قرآن پڑھوں گا۔“

”کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟“ پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

”پڑھوں؟“ اختر نے پوچھا۔

”ہاں ہاں!“ پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چھو کی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمھارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔“

”ہاں ہاں!“ پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھو کر دی۔

اب کے امر کور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا ”کیا نیند نہیں آتی تھی؟“

”ہاں!“ اختر بولا۔ ”اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی

ہے نیند نہ آئے تو تین بار قل ہو اللہ پڑھو، نیند آجائے گی، اب آرہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔"

"پھر سے پڑھ کر سو جاؤ۔" پرمیشر سنگھ نے کہا۔ "روز پڑھا کرو۔ اونچے اونچے پڑھا کرو۔ اسے بھولنا نہیں ورنہ تمھاری اماں تمھیں مارے گی۔ لو اب سو جاؤ۔" اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لیے بڑھا تو امر کور پکاری "نہیں۔ نہیں۔ بابا۔ بجھاؤ نہیں، ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے!" پرمیشر سنگھ نے حیران ہوکر پوچھا "کس سے ڈر لگتا ہے۔"

"جلتا رہے کیا ہے؟" بیوی بولی۔

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھاکر ہنس دیا "پگلیاں۔" وہ بولا "گدھیاں۔"

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ہو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر کچی نیند میں "پڑوس" کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی۔ مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے اور ابھی پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا اور قل ہو اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔ " وہ کہاں ہے ؟ "

" کون ؟ امر کور "

" نہیں۔ "

" کرتارا ؟ "

" نہیں " پھر کچھ سوچ کر بولا۔ " ہاں ہاں وہی کرتارا ؟ "

" باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا۔ "

پرمیشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جاکر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جاکر اس کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ پھر اسے دور سے گیان سنگھ کے گنے کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دے رکھا ہے لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے۔ مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے، پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا۔ " کیوں بے کرتارا ! تم نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا ؟ "

" اچھا کیا جو مارا " اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

" تمہارے رسول نے تمھیں یہی سمجھایا ہے ؟ " لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ " اور کیا تمہارے گرو نے تمھیں یہی سمجھایا ہے ؟ "

"مسلا" لڑکے نے اسے گالی دی۔

"سکھڑا" اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے۔ مگر پرمیشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا۔ "سنو بیٹے میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا "اماں پاس جاؤں گا۔"

"اور میرے پاس نہیں رہو گے؟" پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمھارے پاس بھی رہوں گا۔" اختر نے معمے کا حل پیش کر دیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کیے تھے، خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا "دیکھو بیٹے! اختر بیٹے! آج یہاں فوج آ رہی ہے، یہ فوجی تمھیں مجھ سے چھیننے آ رہے ہیں۔ سمجھے؟ کہیں چھپ جاؤ، پھر جب وہ چلے جائیں گے نا تو میں تمھیں لے آؤں گا۔"

پرمیشر سنگھ کو دور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولا دکھائی دیا۔ مینڈھ پر چڑھ کر اس نے لمبے ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا "فوجیوں کی لاری آ گئی......" وہ مینڈھ پر سے کود پڑا اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا۔ "گیانے او گیان سنگھ!" وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر

سے نکل کر آیا ۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے ہاتھ میں تھوڑی سی گھاس تھی ۔ پرمیشر سنگھ اُسے الگ لے گیا۔ اُسے کوئی بات سمجھائی ۔ پھر دونوں اختر کی طرف آئے ۔ گیان سنگھ نے فصل سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اُسے اختر کے حوالے کر کے بولا " آؤ بھئی کرتارے ۔ تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو ۔ جب تک یہ فوجی چلے جائیں گے ۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ ہتھیانے آئے ہیں ۔ اونہ !" پرمیشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی ۔ " جاؤں ؟ "

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا جکڑتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی ۔ اجازت پاکر پرمیشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا ۔ بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آ رہا تھا ۔

گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا ۔ پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا ۔ ان سے بات کر کے ادھر آدھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت میں رک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے ۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبردار بھی تھا ۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں ۔ " لڑکے کی بات دوسری ہے ۔" کسی نے پرمیشر سنگھ کے کان میں سر گوشی کی اور آس کے پاس سکھ پرمیشر سنگھ سمیت زیر لب مسکرانے لگے ۔ پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی ۔ اس نے اس مامتا پر بڑا زور دیا جو ان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور

ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے ہتھیا لی گئی تھیں۔ " اور مذہب کا کیا ہے دوستو! " اس نے کہا تھا۔ " دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بنانا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے چرا لیتے ہو، آن کی آبرو پر ناچتے ہو۔ ہم سکھ ہیں، ہم مسلمان ہیں، ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں، ہم رسول کے غلام ہیں۔"

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا اور ان سے ہاتھ ملایا اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پرمیشر سنگھ کو مبارک باد دی، پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارک بادیں دینے لگے۔ لیکن پرمیشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری کے جانے کے بعد لٹا لٹا سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں میں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آ گئی۔ پرمیشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی ڈاڑھی کھجاتا اور ادھر آدھر دیکھ کر پھر سے سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا یک بچہ اچانک ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔ " ہائے اتنا بڑا کانٹا اتر گیا پورے کا پورا " وہ چلایا اور پھر اس کی ماں ننگے سر اوپر بھاگی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سوئی منگوائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک

کر پکاری۔ ''ارے میرا دوپٹہ تو اوپر پھینک دینا، کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔''

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر بعد چونک کر اپنی بیوی سے پوچھا۔ ''کیا تمھیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے؟''

''لو اور سنو!'' بیوی بولی اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی۔ ''کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے؟''

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور اپنی ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمیشر یوں بدک کر جلدی سے اٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا تھال اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے دالان میں آیا۔ اور بولا ''آج دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔''

اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے ایک کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔ کھیتوں میں آ کر وہ بولا ''یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے، یہ جب ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔''

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ چاند یہاں چمک رہا ہے نا، یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا۔ تمھاری اماں کے دیس میں۔''

اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ چاند جب ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمھاری اماں کے سر پر بھی ہوگا۔"

اب کے اختر بولا "ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند دیکھ رہی ہوں گی؟"

"ہاں!" پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی۔ "جاؤ گے اماں کے پاس؟"

"ہاں!" اختر بولا۔ "پر تم لے تو جاتے نہیں۔ تم بہت برے ہو۔ تم سکھ ہو۔"

پرمیشر سنگھ بولا "نہیں بیٹے! آج تو تمھیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمھاری اماں کی چٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لیے اداس ہوں۔"

"میں بھی تو اداس ہوں۔" اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"میں تمھیں تمھاری اماں کے پاس لے جا رہا ہوں۔" "سچ؟" اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا۔ "ہم اماں پاس جا رہے ہیں۔ پرموں ہمیں اماں پاس لے جائے گا۔ ہم وہاں سے پرموں کو چٹھی لکھیں گے۔"

پرمیشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا "گانا سنو گے؟"

"ہاں!"

"پہلے تم قرآن سناؤ۔"

"اچھا!" اختر قل ہو اللہ پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر

اس نے اپنے سینے پر چھو کی اور بولا " لاؤ تمھارے سینے پر بھی چھو کردوں ۔"

رک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا ۔ اختر نے لٹک کر اس کے سینے پر چھو کر دی اور بولا " اب تم سناؤ ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا ۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا ۔ اس لیے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کیے اور گاتے ہوئے تیز چلنے لگا ۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا ۔

بنتو دا سر بن ورگاجے
بنتو دا منہ چن ورگاجے
بنتو دا لک چترا گاجے
لوکو
بنتو دا لک چترا

" بنتو کون ہے ؟" اختر نے پرمیشر سنگھ کو ٹوکا ۔

پرمیشر سنگھ ہنسا ۔ پھر ذرا سے وقفے کے بعد بولا ۔ " میری بیوی ہے امر کور کی ماں ۔ اس کا نام بھی تو بنتو ہے ۔ تمھاری اماں کا نام بھی بنتو ہو گا ۔"

" کیوں ؟" اختر خفا ہو گیا ۔ " وہ کوئی سکھ ہے ؟"

پرمیشر سنگھ خاموش ہو گیا ۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا ۔ رات خاموش تھی ۔ کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا ۔ اختر تو پہلے گیدڑوں کی آواز پر ڈرا ، مگر پرمیشر سنگھ کے

سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے بعد اس نے پرمیشر سنگھ سے پوچھا۔ ” اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟“ پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اُسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گورو گوبند کی کہانی تھی لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں میں بدل دیا اور اختر، ” پھر؟ پھر؟“ کی رٹ لگاتا رہا اور کہانی ابھی جاری تھی جب اختر ایک دم بولا۔ ارے چاند تو سر پر آ گیا۔“

پرمیشر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا۔ اور بولا ” تمھاری ماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا؟“

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا۔ جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پرمیشر سنگھ بڑی مشکل سے اُسے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ”جاؤ بیٹے۔ تمھیں تمھاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس کی آواز کی سیدھ میں ......“

” شش!“ اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور سرگوشی میں بولا۔ ” اذان کے وقت نہیں بولتے!“

” پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!“ پرمیشر بولا۔

” شش!“ اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پرمیشر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا۔ اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ” میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا۔ بس تم ......“

"کیوں نہیں جاؤ گے؟" اختر نے پوچھا۔

"تمھاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔" پرمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلا لیا۔ "بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا، وہاں جا کر اپنا نام بتانا۔ کرتارا نہیں، اختر۔ پھر اپنی اماں کا نام بتانا، اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔"

"لکھوں گا۔" اختر نے وعدہ کیا۔

"اور ہاں تمھیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے نا! اسے ادھر بھیج دینا۔ اچھا!"

"اچھا!"

پرمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا۔ "جاؤ۔"

اختر چند قدم آگے چلا مگر پلٹ آیا۔ "تم بھی آجاؤ نا۔"

"نہیں بھئی۔" پرمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا۔

"تمھاری اماں نے چھٹی میں یہ نہیں لکھا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اختر بولا۔

"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پرمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

"اچھا"! بات اختر کی سمجھ میں آگئی اور وہ قل ہو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

نرم نرم پو افق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے

ٹیلے پر بیٹھا رہا اور جب اختر نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہ وہاں سے اُتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے ۔ ” کون ہو تم ؟ “

” اختر! “ وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا اس کو جانتی ہے۔

” اختر ! “ دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر اُدھر بکھر گئے۔

اختر نے بھنا کر پگڑی چھین لی۔ پھر سر کو ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا ”میرا کنگھا لاؤ۔ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمہیں مار دوں گا۔“

ایک دم دونوں سپاہی زمین پر گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے ۔ ”ہالٹ۔“ ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اجالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا... اور ایک نے فائر کردیا۔ اور اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رکے تو پرمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پگڑی باندھ چکا تھا ۔ مگر خون اس کی پگڑی کی سینکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا تھا اور وہ کہہ رہا تھا ۔ ”مجھے کیوں مارا تم نے ! میں تو اختر کے کیس کاٹنا

بھول گیا تھا ۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو ۔''

دور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اس کے کیس ہوا میں اڑ رہے تھے ۔

# مرزا عظیم بیگ چغتائی

اردو زبان مرزا عظیم بیگ چغتائی کو ہمیشہ یاد رکھے گی جنھوں نے اردو ادب کے دور جدید میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ویسے تو مزاحیہ مضامین یا مزاحیہ خاکے ہر شخص لکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر واقفیت اور مناسبت کا پیش نظر رکھنا ، اس کے ساتھ دلچسپی قائم رکھنا عظیم بیگ چغتائی کا خاص حصہ ہے۔

چغتائی کی زندگی غموں سے خالی نہ تھی۔ بایں ہمہ وہ اپنے قہقہوں سے ان کو ہمیشہ دبائے رکھتے تھے۔ اپنے درد کی ہر ہر ٹیس سے وہ متاثر ہوتے مگر دوسروں کے لیے انھیں ٹیسوں سے مسکراہٹ اور قہقہے پیدا کرتے۔ اپنے غم پر آپ ہی ہنسنا بڑے ظرف کا کام ہے۔ اسی مزاحیہ انداز میں وہ معاشرے کی برائیوں کو جو گھن کی طرح معاشرہ کو کھائے جاتی تھیں بڑے موثر لہجہ میں بیان کر دیتے ہیں۔

چغتائی کے انداز میں فصاحت اور ظرافت ایسی چیزیں ہیں جس کی وجہ سے یہ منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کی ظرافت محض پھکڑ پن کا نتیجہ نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ اس سے اصلاح معاشرہ کا کام لیتے ہیں۔ یہی ان کا فن ہے اور مقصد بھی۔

# ممتحن کا پان

(اس کہانی کے ہیرو پان کھانے والوں سے نفرت کرتے تھے۔ ایک سفر میں ایک پان کھانے والے کا ساتھ ہوا۔ اب قصہ سنیے۔)

میں نہ اب بد اخلاق یا کج خلق ہوں اور نہ پہلے کبھی تھا، مگر پان کھانے والے مسافروں سے مجھے چوں کہ بغض تھا لہٰذا میں اب سوچ رہا تھا کہ ان کو یہاں سے کس طرح ہٹاؤں۔ تھوڑی ہی دیر نہ گزری تھی کہ کھٹکا ہوا۔ میں جان گیا اور پان کی ڈبیہ کا گیلا گیلا سرخ کپڑا میری نظر کے سامنے بغیر دیکھے ہی آگیا۔ مڑ کر دیکھا تو آن کے ہاتھ میں پان کا ایک ٹکڑا ہے۔ اخلاقاً انھوں نے میرے سامنے پیش کیا۔ یہ گویا تازیانہ ہوگیا۔ میں نے جل کر کہا "مجھے اس حماقت سے معاف کیجیے۔"

میں نے دیکھا کہ اس جملہ نے کیا کام کیا مگر انھوں نے سوائے ایک سر کی جنبش کے زبان سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بھی نہ گزری تھی کہ انھوں نے کھڑکی کے باہر سر ڈال کر تھوکا، میں نے مڑ کر برجستہ کہا "قبلہ اگر یہ دھندا کرنا ہے تو براہ کرم دوسری جگہ تلاش کیجیے۔"

"کیا فرمایا جناب نے؟"

"میں نے یہ فرمایا کہ جناب یہ لال پچکاریاں کسی دوسری جگہ چھوڑیں۔"

انھوں نے کہا ! ”معاف کیجیے گا میں اس قسم کی گفتگو کا عادی نہیں ۔“

”اگر جناب ایسی گفتگو کے عادی نہیں تو میں بھی اس کا عادی نہیں کہ آپ میرے پاس بیٹھ کر گندگی پھیلائیں ․ ․ ․ ․“

مارے غصہ کے ان حضرت کا منہ لال ہو گیا مگر نہایت ہی تحمل سے انھوں نے بالکل خاموش ہو کر میری طرف سے منہ موڑ لیا اور سنی ان سنی ایک کر دی ۔

”آپ کو یہ نہیں چاہیے تھا ۔“ میرے ساتھی نے میری بد اخلاقی کو دیکھتے ہوئے کہا ۔

”میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو پان سے کتنی نفرت ہے ۔“

(۲)

ہمارے نئے ساتھی جو غازی آباد سے بیٹھے تھے عجب کہ کلاس فیلو نکلے ۔ انھوں نے بھی ایل ایل ۔ بی فائنل کا امتحان علی گڑھ سے دیا تھا اور میں نے بھی ۔ امتحان کا نتیجہ ابھی شایع نہ ہوا تھا ۔ لامحالہ امتحان کا ذکر ہونے لگا ۔ ان کے سب پرچے اچھے ہوئے تھے اور میرے بھی ۔ گزشتہ سال وہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئے تھے اور میں فرسٹ ڈویژن میں ۔ اپنے پاس ہونے کا مجھ کو قطعی یقین تھا ۔ دل سے خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ تعلیم کی آخری منزل بھی ختم ہوئی ۔

علی گڑھ سے گاڑی چلی ، ایک بات میں نے عجیب نوٹ کی [۱] اب تک تو وہ پان کھانے والے حضرت کچھ رنجیدہ اور کبیدہ تھے مگر اب وہ میری طرف بڑی دیر سے دیکھ رہے تھے ۔ ان کے چہرے

۱ ۔ نوٹ کی : خاص طور پر محسوس کی ، غور طلب معلوم ہوئی ۔

سے تمام غصہ رفو چکر ہو چکا تھا ۔ شاید وہ صاف دل تھے اور میری بداخلاقی بھول گئے تھے ۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا ۔ ”آپ نے امسال ایل ایل ۔ بی ۔ فائنل ، کا امتحان دیا ہے ؟“ یہ کہتے ہوئے ڈبیا کھولی اور میں نے بمشکل ”جی ہاں“ کہا تھا کہ انھوں نے ایک پان مجھے پھر پیش کیا اور مسکراتے ہوئے انھوں نے کہا ”آپ کو پان سے نفرت ہے مگر آپ اس کو کھا کر دیکھیں ۔“

میں نے ان کی طرف دیکھا ........ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ تمام سنجیدگی کو رخصت کر کے مجھ کو چڑا رہے تھے تاکہ بدلہ لیں ...... قطعی یہی ہے ...... یہ خیال کرتے ہی مجھ کو سخت غصہ آیا .... انھوں نے پان اور آگے بڑھایا اور میں نے اس کا جواب یہ بہتر سمجھا کہ تسلیم کر کے اُن سے لے کر کھڑکی میں سے باہر پھینک دیا ۔ مجھے یقین ہوا کہ میں کامیاب رہا ۔ مگر وہ حضرت بجائے خفا ہونے کے اب شاید مجھے تختۂ مشق بنانے پر تلے ہوئے تھے ۔ دوسرا پان پیش کر کے بولے ”اگر اب اس کو بھی آپ نے پھینک دیا تو عمر بھر پچھتانا پڑے گا ۔“

منہ سے کچھ سخت جملہ نکلتے نکلتے رہ گیا لیکن پھر بھی بجائے ان کو برا کہنے کے پان کی مذمت کرنے لگا ۔

”معاف کیجیے گا“ انھوں نے پان کھا کر کہا ۔ ”آپ میں تہذیب نام کو نہیں ہے ۔“ یہ الفاظ انھوں نے رویہ بدل کر کچھ سنجیدگی سے کہے ۔

میں نے کہا : ”جی ہاں آپ صحیح فرماتے ہیں لیکن مجھ کو اس پر فخر ہے کہ پان کھانے والوں کی بد تہذیبی کا جواب بد تہذیبی سے دوں ۔“

"ماشاءاللہ !"، یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اپنا سوٹ کیس کھولا اور میرا بازو پکڑ کر ایک کاپی میرے سامنے کر کے کہا "آپ اس خط کو پہچانتے ہیں ؟"

میں کچھ سٹ پٹا سا گیا اور کچھ عقل نے کام نہ کیا - میں نے ان حضرت کے چہرے کی طرف دیکھا جو میرے سٹ پٹا جانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے . . . . میرے سامنے محمڈن لا (قانون محمدی) کی امتحان کی کاپی تھی اس پر سرخ رنگ سے نمبر اس طرح دیے ہوئے تھے ۶۵ + ۱۰ گویا میں نے سو نمبروں میں سے پچھتر نمبر پائے تھے - نمبروں کو دیکھ کر کچھ خوشی سی ہوئی تھی کہ وہ بولے "آپ نے پرچہ بہت اچھا کیا تھا اور آپ نے ۶۵ نمبر حاصل کیے تھے لیکن چوں کہ آپ نے علاوہ قانون کے احادیث کے حوالے بھی دیے تھے ، میں نے آپ کو دس نمبر اور دیے تھے - لیکن اب مجھ کو معلوم ہوا کہ آپ اسلامی قانون تو بڑی چیز ہے اسلامی تہذیب سے بھی ناواقف ہیں -" یہ کہہ کر انھوں نے میرے اور میرے ساتھی کے سامنے سرخ پنسل جیب سے نکال کر ۶۵ نمبر کو سرخی سے کاٹ دیا اور اپنے وہاں دستخط بھی کر دیے !

اب مجھ کو حروف "ٹی - ایچ" کے معنی بھی معلوم ہو گئے تھے جو میں نے ان کے ہینڈ بیگ پر دیکھے تھے -

یہ حضرت میرے ممتحن تھے ! . . . . . . . میری حالت جو تھی وہ تھی مگر میرے ساتھی جو خود طالب علم تھے ، سخت متعجب اور متاثر تھے - دراصل ہم دونوں ہی ہکا بکا تھے -

میری کاپی وہ اطمینان سے اپنے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے بولے "کم از کم تین سال تک تو آپ پاس ہونے کا خیال ہی

ترک فرما دیں - ایک بد تہذیب شخص اس سے کم عرصہ میں تہذیب نہیں سیکھ سکتا -"

میرے ہوش بجا نہ تھے ، وہ غیر متعلق ہو کر اپنا چہرہ اخبار سے چھپائے ہوئے دوسری بنچ پر جا بیٹھے - میرے ساتھی کہنے لگے کہ " میں گواہ ہوں آپ ان پر دعویٰ کر دیجیے گا -" شاید انھوں نے یہ سن لیا جو اخبار پھینک کر بولے - " شاید آپ دونوں صاحبوں سے قانون ، میں زیادہ جانتا ہوں - جناب من اگر یہ ممکن ہوتا تو ہر ممتحن پر طالب علم ایک گواہ تلاش کر کے مقدمہ دائر کر دیتے - میرا فیصلہ اٹل ہے - آپ شوق سے دعویٰ کریں -"

میں تو چپ تھا مگر میرے ساتھی نے ان سے بحث کرنا شروع کی -

" میری جان مت کھایے -" یہ کہہ کر وہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے -

ہاتھرس کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا اور میرے ساتھی اترنے والے تھے - ممتحن صاحب نے اپنی پان کی ڈبیا کھول کر ایک پان نکالا اور میرے سامنے پیش کیا - میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا - میں نے معصومیت سے ان کی طرف دیکھا - میرا ہاتھ خود بخود بڑھ گیا ..... آپ یقین کریں کہ میں پان کھا رہا تھا !

" چھالیہ تو لیجیے -" انکار کرتے ڈر لگا - لہذا لے کر منہ میں ڈال لی - وہ اپنی جگہ پر جا بیٹھے اور یہاں چھالیہ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے منہ کو کوئی چھیل رہا ہے - لیکن میں نے چبا چبا کر اس کو سرمہ کر ڈالا - پان کھانے کے قواعد کی رو سے اس منزل پر پہنچ کر پان کھانے والا

تھوک سکتا ہے - تھوکنے کے لیے بیت الخلا کو بہتر سمجھا ، تاکہ ممتحن صاحب نہ دیکھ سکیں - وہاں جو چھالیا تھوک کر نکلا تو ممتحن صاحب کچھ تحکمانہ لہجے میں بولے " کیا آپ نے پان تھوک دیا ؟ "

میں سن سے ہو گیا اور جھوٹ بولا " جی نہیں ۔" مگر نہایت ہی مردہ آواز سے کہا ۔

اس دوران میں میرے ساتھی میرے چہرے کو فلسفیانہ انداز سے دیکھ رہے تھے - میرا چہرہ واقعی ہوگا بھی اسی لائق - ہاتھرس اسٹیشن آیا اور وہ اتر گئے ۔

میرے ساتھی کے چلے جانے کے بعد اب میں نہ معلوم کن کن خیالات میں غرق تھا ......... خوشامد کروں .... کبھی کی نہیں ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آتی ہی نہیں ....... مگر ہاتھ جوڑنے سے کام بن جائے گا ! پھر خیال آیا لاحول ولاقوۃ آئندہ سال دیکھا جائے گا ورنہ پھر نوکری کریں گے ایسی خوشامد سے تو موت بہتر ہے ۔

ٹونڈلہ کا اسٹیشن آیا ۔ میں آگرہ جا رہا تھا کیوں کہ سخت ضروری کام تھا ۔ میں چونک سا پڑا ........ اب کیا کروں ؟ واللہ اعلم ممتحن صاحب کہاں جا رہے ہیں - خیر کم از کم کانپور کا تو ٹکٹ لے لینا چاہیے - چناں چہ یہی کیا ۔ ٹکٹ لے کر واپس آیا تو ممتحن صاحب بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے باتیں کر رہے تھے - میں بیٹھ گیا ۔ ممتحن صاحب نے پان کی ڈبیا نکالی .... میں گھبرایا مگر مجبوری ! انھوں نے پیش کیا اور مجھے خوش ہو کر کھانا پڑا ۔

"کیوں جناب پان بھی خوب چیز ہے!" ممتحن صاحب نے اپنے دوست سے کہا۔

انھوں نے جواب دیا۔ "جی ہاں مجھے تو بغیر پان کے سفر دوبھر ہو جاتا ہے۔"

"یہی حال میرا ہے" ممتحن صاحب بولے اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر پوچھا "کیوں جناب آپ کی کیا رائے ہے؟"

میری حالت کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ ممتحن صاحب کے چہرے سے فتح کی مسرت عیاں تھی۔ میں بت کی طرح شکست خوردہ تھا۔ گلا صاف کر کے کہا: "جی ہاں۔"

بیرسٹر صاحب اپنے دوست سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے، میں سنتا رہا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اب مجھے کہاں جانا ہے۔ کانپور کے اسٹیشن پر میں نے بیرسٹر صاحب کی خدمت میں التجا کی۔ مجبوراً انھوں نے کہا "فرمائیے.... کیا کہتے ہیں..." بقول کسے یہاں صورت سوال تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے کہا "میری زندگی تباہ ہو جائے گی.... میں کہیں کا نہ رہوں گا...." وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں کا مختصر جواب یہ تھا "معاف کیجیے میں جب ایک مرتبہ کوئی کام کر چکتا ہوں تو مشکل سے رائے تبدیل کر سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے لکھنؤ والی گاڑی کا رخ کیا۔ میں نے بھی دل میں کہا پیچھا نہ چھوڑوں گا۔

خدا کی پناہ! ضلع جونپور کے ایک غیر معروف گاؤں میں جانا تھا۔ راستہ میں نہ میں نے ایک لفظ بیرسٹر صاحب سے

کہا اور نہ انھوں نے - جونپور کے ایک غیر معروف ریلوے اسٹیشن پر شاید بیرسٹر صاحب اور میں یہ دو ہی اترنے والے تھے - بیرسٹر صاحب نے شاید مجھ کو عمداً دیکھا تک نہیں - ایک چھوٹی سی بیلوں کی گاڑی پر ان کا مختصر اسباب رکھ دیا گیا اور میں نے دیکھا کہ گرد و غبار میں بیل تیزی سے جا رہے ہیں - گاڑی کو دیر تک کھڑا دیکھتا رہا کہ اک دم سے چونک پڑا - میں نے یہ بھی نہ معلوم کیا تھا کہ وہ کون سا گاؤں ہے جہاں بیرسٹر صاحب گئے ہیں - مگر ایک دہقانی نے از راہ عنایت مجھے یہ پتا دے دیا کہ فلاں گاؤں کے زمیندار صاحب کی گاڑی تھی - میں مزدور کے سر پر اسباب لدوا کر چل دیا -

شام کے چار بجے میں اس گاؤں میں پہنچا - زمیندار صاحب کا پتا لگنا کیا مشکل تھا - تھوڑی ہی دیر میں میں ان کے عالی شان قلعہ کے باہر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں - مزدور کے ساتھ اسباب باہر چھوڑا اور اندر داخل ہوا - سامنے چبوترے پر بیرسٹر صاحب پنکھے کے نیچے لیٹے ہوئے تھے - دو آدمی اور بھی کرسیوں پر لیٹے تھے - کچھ باتیں ہو رہی تھیں - کچھ ٹھٹکا، مگر آگے بڑھا - بیرسٹر صاحب نے سلام کا جواب دیا - دریافت کیا کہ ”اسباب کہاں ہے؟“ نوکر سے اسباب منگایا - ایک کمرہ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ جا کر غسل کر لیجیے اور کپڑے اتاریے - میں بھی بے تکلفی سے سیدھا چلا گیا - نہا دھو کر نکلا تو کمرے ہی میں دودھ کا دیہاتی مقدار میں شربت موجود تھا - بیرسٹر صاحب نے صورت سے معلوم کر لیا ہوگا کہ بھوکا ہے - کمرے سے نکل کر باہر آ بیٹھا - بیرسٹر صاحب نے پان پیش کیا جو کھانا پڑا - بیرسٹر صاحب چار پان

کھلا چکے تھے اور پان ختم ہوتے ہی مجھ کو دوسرا پان دے دیتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد، میں آپ سے کیا کہوں کہ پان کھاتے کھاتے میرا کیا حال ہو گیا۔ دو تین پانوں تک تو اس کا احساس بھی رہا کہ چونا منہ میں لگ رہا ہے مگر شام تک تو منہ کی حالت ہی اور ہو گئی۔

یہ بیرسٹر صاحب کی سسرال تھی اور شام کو ان کے خسر صاحب نکلے۔ میرا تعارف کرایا گیا کہ میں ایک کرم فرما ہوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہوں۔ رات کے آٹھ بجے تک داماد اور خسر اور کرم فرما بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مگر جو حال کرم فرما کا پان کھاتے کھاتے ہوگیا اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

"پان بھی خوب چیز ہے۔" بیرسٹر صاحب نے کھانا کھانے کے بعد مجھے پان پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جواب نہیں رکھتا۔" مجھے کہنا پڑا۔

"کھانے کو ہضم کرتا ہے اور منہ کی گندگی کو دور کرتا ہے اور مفرح ہے۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔

"بہت عمدہ چیز ہے" خسر صاحب بولے "لیکن اعتدال کے ساتھ۔"

صبح کو مجھے موقع ملا کہ خسر صاحب سے اپنی مصیبت کا حال بیان کروں۔ صرف میں اور وہ تھے۔ انھوں نے میری داستان تعجب سے سنی، لیکن ہنسے بھی اور مجھ سے وعدۂ سفارش کیا۔ قصہ مختصر یہ طے ہوا کہ میں چار دن اور ٹھہروں اور رات دن پان کھاؤں۔ ان چار دنوں میں کیا بتاؤں کہ کتنے

پان کھانا پڑے ۔ منہ کا برا حال تھا مگر پان پر پان کھاتا تھا اور اُف نہ کرتا تھا ۔ چلتے وقت بیرسٹر صاحب نے کہا کہ میرا پان اب آپ کبھی نہ بھولیں گے ۔ اور بے شک ! حالاں کہ سال بھر سے زائد گزر گیا مگر ہنوز یاد تازہ ہے اور شاید کبھی نہ بھولے .... نتیجہ .... اب خوب پان کھاتا ہوں ۔

## عصمت چغتائی

عصمت کو ادبی دنیا میں قدم رکھے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ ان کی فنی صلاحیت اور گہری نظر نے دنیائے ادب میں یک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ہمارے معاشرہ کی برائیوں اور بھلائیوں دونوں کو عصمتؔ نے جانچا ہے۔ چغتائی خاندان سے منسلک ہونے کی وجہ سے انھوں نے پرانے خاندانوں کی نام نہاد وضعداری اور تصنع اور معاشرتی کمزوریوں کو دیکھا ہے، جسے انھوں نے بے نقاب کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا، بلکہ فراوانی جذبات میں وہ قدرے عریانی کی طرف بھک جاتی ہیں مگر ان کی نیت اور ان کے مقصد کی عظمت کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ عصمت کا مقصد عموماً یہ ہوتا ہے کہ ہماری معاشرت کے تاریک پہلوؤں کو اس طرح واضح کر دیں کہ لوگ حقائق کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ وہ اس نظریہ سے متفق نہیں ہیں کہ ناگفتنی کو روز روشن سے روشناس نہ کرایا جائے۔ وہ کھل کر ڈنکے کی چوٹ پر بات کہنے کے عادی ہیں۔

عصمت کے فن کی سب سے بڑی خوبی ان کی فطری جرأت ہے۔ چست محاوروں سے اپنی تحریروں کو وہ پر اثر بنا دیتی ہیں، جسے ایک ڈاکٹر کے نشتر سے بھی تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

## بیلو کی پٹائی

اماں اور ابا دونوں ہی بیلو کو جان سے زیادہ چاہتے تھے۔ اگر ذرا سی چھینک بھی آجاتی تو دونوں گھبرا جاتے۔ پر دادی اماں کا تو کہنا ہی کیا! وہ تو گھبرانے اور بوکھلانے میں ماہر تھیں۔ محلہ ٹولہ میں کوئی لڑکا پٹتا یا لڑکی کی کمر پر دھموکے پڑتے تو دادی اماں کو دورہ پڑ جاتا۔

اماں اور ابا تو کالج چلے جاتے۔ دادی اماں باورچی خانہ میں جٹ جاتیں اور بیلو کو چھوٹ مل جاتی۔ بیلو کا جو جی چاہتا کرتا رہتا۔ کوئی دوسرا بہن بھائی بھی اللہ نے نہ دیا کہ ذرا اسے چھیڑ کر رلانے میں ہی مزا آجاتا۔ گھر اس قرینے کا تھا کہ کوئی شرارت ہی ممکن نہ تھی۔ پیڑ سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان پر چڑھ کر گرنے سے چوٹ لگنے کا بھی امکان نہ تھا اور بیلو کا جی چاہتا تھا کہ کوئی شرارت کرے۔ گنجینے میں سے مٹھائی چرا کر کھانے سے کوئی فائدہ نہ تھا کیوں کہ مٹھائی تو بیلو ہی کے لیے رکھی تھی، وہ کھاتا ہی نہ تھا۔ سارے گھر کو شکایت تھی بیلو ٹھیک سے کھانا نہیں کھاتا۔ کیسا کیسا لوگ اسے پھسلاتے بہلاتے مگر بیلو کو مٹھائیوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

پیار تو اتنا ملتا تھا کہ بیلو کا جی متلا چکا تھا۔ مار اس پر کبھی پڑی ہی نہیں۔ ابا ذرا سا گھڑک دیتے تو بیلو کا دم نکل

جاتا۔ پھر اماں ابا سے غصہ ہو جاتیں کہ "میرے بچے کو کیوں ڈانٹا"، اور سب سے زیادہ دادی اماں اٹھتے بیٹھتے لتاڑتیں۔

"بچے کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے۔ یتیم خانہ میں بھجوا دو۔ ڈانٹ ڈانٹ کے اس کا خون خشک کر دیا ہے۔"

حالاں کہ بیلو کا قطعی خون خشک نہ ہوا تھا۔ رس بھری کی طرح بھر رہا تھا۔ سوئی چبھوؤ تو پچکاری نکلے۔ مگر وہ سب کو بہت ناتواں اور کمزور نظر آتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا چوں کہ پیٹا نہیں جاتا اس لیے پھس پھسا ہو کر رہ گیا ہے۔ شرارت بھی نہیں کرتا۔ ایسا بھی کیا بچہ کہ بس بڈھوں کی طرح رہتا ہے۔

اور بیلو کے دل میں بھی یہ بات بیٹھ گئی، ضرور اس میں کچھ کمی ہے جو وہ مارا پیٹا نہیں جاتا۔ اس دن سے وہ بڑا چپ چپ اور فکر مند رہنے لگا۔ گھنٹوں بیٹھا شرارتیں سوچا کرتا مگر شرارتیں سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتیں۔ وہ تو نہ جانے دماغ کے کس کونے سے ابھرتی ہیں اور اس سے پہلے کہ انسان کچھ سوچے خود بخود ہوجاتی ہیں۔ پڑوس میں جو چھوکرا اوپر کا کام کیا کرتا تھا، آئے دن پٹتا اور بیلو حسرت سے اس کی سوجی ہوئی ناک اور پھولے ہوئے ہونٹ دیکھتا۔ اے کاش ایک زور کا تھپڑ ایک دن اس کے گال پر بھی پڑے۔ مزا تو چکھنا چاہیے۔ آخر پٹائی کیسی ہوتی ہے؟ بڑی سوچ بچار کے بعد بیلو کو ایک ترکیب نظر آئی اور اس نے کھانے کے کمرے میں جا کر ایک چائے دانی جو صرف مہمانوں کے آنے پر میز پر سجائی جاتی تھی، اٹھالی اور بیچ کمرے میں زور سے پٹخ دی۔ دادی اماں دو بالشت اونچی اچھل پڑیں اور جب ٹوٹی ہوئی کیتلی دیکھی تو جان میں جان آئی، وہ سمجھی تھیں بیلو گر پڑا۔

اماں ابا کو جب معلوم ہوا کہ کیتلی بیلو سے ٹوٹ گئی ہے تو وہ ہو کھلا گئے ۔

"تمھارے تو کہیں چوٹ نہیں لگی بیٹے ؟"

"نہیں اماں ......... مگر کیتلی بہت اچھی تھی ...." بیلو بسورا ۔

"اونھ خاک ڈالو کیتلی پر ............. کانچ وانچ نہیں چبھا ، بس یہی خیریت ہو گئی ۔"

اس دن سارے محلے میں خبر اڑ گئی کہ بیلو بال بال بچ گیا ورنہ کیتلی کی کانچ کے ذرے اس کے پیروں میں چبھ کر سپٹک ہو کر وہ مر ہی گیا ہوتا ۔

دادی اماں نے ڈانٹ بتائی سو الگ ۔ الٹی سیدھی جگہ چیزیں رکھ دی جاتی ہیں ، بچہ جان سے جاتا تب کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ۔ اس سے تو اسے یتیم خانہ میں دے دو ۔ پل جائے گا ۔

"ارے تمھاری اماں نے کیتلی توڑنے پر مارا بھی نہیں؟" بیلو کے پڑوسی نے پوچھا ۔

"نہیں ۔" بیلو نے مردہ دل اور دکھی ہو کر کہا ۔

"اماں یار بالکل مرزا پھویا ہو ۔" پڑوسی نے چڑایا ، کیوں کہ حامد میاں آئے دن دھنکے جاتے تھے ۔

ابا مارتے ، اماں مارتیں ، چچا ماموں مارتے ، اور ماشاءاللہ بڑے بھائی بہن بھی آتے جاتے چپتیاتے ۔ حامد میاں باوجود اتنی پٹائی ہونے کے نہایت بد ذات واقع ہوئے تھے ۔ بیلو کو بتا رکھا تھا کہ صرف بڑے اور بہادر لوگ ہی پٹا کرتے ہیں ۔ انہیں دعویٰ تھا کہ وہ دو منٹ میں پٹ کر دکھا سکتے ہیں ۔

کیا دماغ پایا تھا حامد میاں نے - جس طرف نکل جاتے لوگ توبہ بول جاتے -

سب حامد میاں کے نام پر تھڑی تھڑی کرتے تھے مگر بیلو انہیں بالکل نپولین یا سکندر اعظم سمجھتے تھے - حسرت سے وہ ان کے کارنامے سنا کرتے - اور کیتلی توڑ دینے پر بھی بجائے پٹائی کے ان کی جان کا صدقہ دیا گیا تو حامد میاں کے سامنے رو پڑے -

" یار تم بھی لونڈیا ہی ہو - کیتلی کے بجائے اماں کا چائنا والا سٹ توڑتے تب مزہ آتا - "

" وہ تو بہت خوب صورت ہے " بیلو نے پریشان ہو کر کہا - " ہس مر گئی میا ، ہشت لونڈیا کہیں کا ! " حامد میاں قہقہہ مارتے مرغیوں کو ستانے چل دیے -

بیلو کو وہ سٹ بہت پیارا تھا - کیا نازک نازک پھول پتیاں تھیں - وہ گھنٹوں الماری سے ناک لگائے ان حسین نقوش کو دیکھا کرتا اور جی نہ بھرتا مگر عزت اور خودی کا سوال آن پڑا تھا - لاڈلے سیٹ کی قربانی دینا ہی ہوگی -

اور جب اماں نے چائنا سٹ کے پرخچے دیکھے تو کلیجہ تھام کر بیٹھ گئیں ، ابا بھی اسی وقت تھکے ہارے کالج سے آن پہنچے -

" اب ایسا سٹ تو تین چار سو روپے میں بھی نہیں ملے گا - " انہوں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا -

مگر نہ کسی نے بیلو کو ڈانٹا نہ مارا - بیلو کا دل بجھ گیا - اپنی حماقت پر بڑا دکھ ہوا - اسے اداس دیکھ کر جب ابا اور اماں پریشان ہوئے تو بیلو کے آنسو نکل آئے -

" کیا بات ہے بیٹا - " اماں نے گھبرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا -

"سٹ ٹوٹنے کا افسوس ہے نگوڑے کو۔" دادی اماں نے بتایا۔

"ارے واہ صدقے کروں ایسے سٹ کو اپنے بیلو پر سے، نابیٹا، تم نے کوئی جان بوجھ کر تو نہیں توڑا۔"

اب بیلو کیسے کہتے کہ ہم نے مار کھانے کے لیے جان بوجھ کر سٹ توڑا تھا۔ حامد میاں نے فیصلہ کیا کہ بیلو کی قسمت ہی خراب ہے ورنہ سٹ پر تو انہیں مار ملنا ہی چاہیے تھی۔ اس کے بعد انھوں نے نہایت بھیانک ترکیبیں بتائیں اور بیلو اماں اور ابا کو واقعی نا انصاف سمجھنے لگے۔ دنیا کے ماں باپ بچوں کو مارتے ہیں۔ آخر انھوں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ انھیں نہیں مارا جاتا اور لگاتار انھوں نے بڑے کمرے کا لیمپ، لیمن سٹ اور روزانہ کے استعمال کی چیزیں توڑنا شروع کیں تب جا کر کہیں اماں نے ابا سے کہا۔

"یہ بچے کو کیا ہوگیا ہے، جو چیز اٹھاتا ہے ہاتھ سے گر پڑتی ہے۔"

"لا پروا ہے۔"، ابا نے دبی زبان سے کہنا چاہا مگر دادی اماں غرائیں۔

تمھیں تو ایک بچہ ہے سو بھی بھاری ہے۔ نہ جانے اس کو کیا ہوگیا ہے۔ رگ پٹھے کمزور پڑ گئے ہیں اور تمھیں الٹی سیدھی باتیں سوجھ رہی ہیں۔ ایسا ہی ہے تو کسی یتیم خانہ میں دے دو بچے کو، پل تو جائے گا۔"

رگ پٹھوں کا جواب سن کر اماں کے اعصاب جواب دے گئے۔ اسی وقت ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ربڑ کی ہتھوڑی بیلو کے گھٹنوں اور کہنیوں پر کھٹا کھٹ ماری۔ بڑی

دیر تک نبض اور زبان دیکھی ۔ پیشاب کا معائنہ کیا ۔ ایکس رے بھی کروا لیتے مگر اس کے لیے دہلی جانا پڑتا ہے ۔

"ویسے تو بچہ بالکل تندرست ہے ۔ کیوں میاں برتن کیوں توڑتے ہو ؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ۔

"آپ کا دماغ خراب ہے ڈاکٹر صاحب ۔" دادی اماں چلائیں، "کل کو بچہ مر جائے گا تو آپ پوچھیں گے : میاں مر کیوں گئے ؟ "

"مگر یہ تو اچھا خاصا موٹا تازہ ہو رہا ہے ۔"

"اے ہے اس منہ میں خاک ! اے ڈاکٹر صاحب اپنی ایڑی تو دیکھو، گو لگا ہوا ہے ۔" بی اماں نے رائے دی ۔

مگر ڈاکٹر صاحب بڑے چنٹ آدمی تھے ۔ انھوں نے بیلو سے قبلوا ہی لیا کہ جناب جان بوجھ کر برتن توڑتے ہیں ۔ بھئی کیوں؟ تو چپ ۔ یہ کیسے کہیں کہ مار کھانے کا ارمان ہے ۔ حامد میاں کی آنکھوں میں عزت بڑھانا ہے ، اس لیے یہ ناچیز برتن توڑتا ہے ۔ اٹک اٹک کر اقبال جرم کر ہی لیا ۔

"ہیں شریر ! جان بوجھ کر توڑتا ہے برتن ؟ " اماں مارے غصہ کے لال ہو گئیں ، ساری مامتا ختم ہو گئی ۔ ابا سے بولیں ۔ "سن رہے ہیں آپ ، اس نے اتنے برتنوں کا چورا کر دیا ۔"

"سن رہا ہوں بھئی تو میں کیا کروں ۔"

"مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا کروں ؟ دیکھو بھلا شرارت کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔ بچے کو سر پر چڑھا رکھا ہے ۔

کل کلاں کو کسی کا خون کر دے گا تب بھی کہہ دیا کیا کروں ۔"

"وہ ایسا ہی بوجھ ہے تو اسے یتیم خانہ میں کیوں ......
دادی اماں بگڑیں۔

"اچھا بھئی آپ جیسا کہیں میں تیار ہوں۔کیا کروں ؟"

"ارے ماریے۔" اماں نے ضد کی۔

"تم خود مار لو۔ آخر مجھ سے کیوں پٹواتی ہو؟" ابا چڑ گئے

"سن رہی ہیں ان کی باتیں" اماں نے دادی سے شکایت کی۔

"سن رہی ہوں بیٹی۔ ابھی تو اللہ نہ جانے کیا کیا اور سنوائے گا۔ غضب خدا کا یہ کیسے ماں باپ ہیں کہ بچے کا ستیا ناس ہو رہا ہے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اللہ ایسوں کو کیوں اولاد دیتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ مع یتیم خانہ والی تجویز کے دادی اماں نے لمبا چوڑا لیکچر جھاڑا اور بہلو کو ابا کی زیادتی پر غصہ آنے لگا۔ بیچارا چور ڈاکو اچکا ہو جائے گا۔ کسی کا خون کر دے گا، اور ابا صاحب کو پروا ہی نہیں۔ دادی اماں اور اماں نے خوب لتے لیے تو ابا نے کہا۔ "اچھا ناشتہ کے بعد مارا جائے گا۔"

اماں نے جل کر کہا "جان جان کر آپ ٹال رہے ہیں۔ مگر آج میں اس پاجی کو پٹوا کر چھوڑوں گی۔"

"تم ہی مار دو نا۔" ابا نے سستی سے آرام کرسی پر لیٹ کر کہا۔ "جی نہیں۔ یہ آپ کا کام ہے اور آپ کریں گے۔" اماں نے سختی پکڑی۔

"میرا قطعی دل نہیں چاہ رہا ہے، بالکل مارنے کا موڈ نہیں ہے۔"

"دیکھیے میں رووں گی اللہ قسم" اماں رو دیں۔

"اچھا بھئی مارے دیتے ہیں ..... بیلو۔"

"جی" بیلو نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ آنے والے خوشگوار موقع کا خیال کر کے اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"کمرے میں چلو۔" ابا نے اطمینان سے اخبار تہہ کیا، دو چار جمائیاں لیں، انگلیاں چٹخائیں اور اٹھے۔

کمرے میں جا کر ابا مچھلیاں دیکھنے لگے۔ بیلو کو مجرم ہی کی طرح کھڑا دیکھ کر بڑے تعجب سے پوچھا "کیا بات ہے بیلو؟"

کیسے ابا ہیں بھلکڑ کہیں کے، حساب کے پروفیسر ایسے ہی اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں؟ یعنی آپ بھول ہی گئے کہ باپ کا فرض انجام دینا ہے۔ بیلو کو ابا کی اس زیادتی پر سخت افسوس ہوا..

"جی وہ ....." بیلو ہکلائے۔

"کیا بات ہے ... سچ بولو .. کیا پیسے چاہئیں کتابوں کے لیے ..."

"جی نہیں ... جی ... وہ ..."

"ایں" ... ابا پریشان ہو گئے۔

"وہ ... جی وہ میں نے برتن توڑے تھے نا ... اماں نے کہا ہے آپ مجھے ماریں ...؟"

"اوہ ہاں ..." ابا کو ایک دم یاد آیا۔ "مگر کاہے سے ماریں" ابا چکرائے۔ "جی ہاتھ سے۔" بیلونے چہک کر رائے دی۔ "جی ہاں خوب آپ شرارت کریں میرے ہاتھ مفت کے ہیں جو میں مارتا پھروں۔"

"تو گھونسا مار دیجیے۔" بیلو نے رائے دی۔

"ہشت ... ... گھونسہ مار دوں ! اور جو تمھاری تلی ولی پھٹ جائے تو پھانسی پر لٹکتا پھروں۔"

بیلو کو اپنی حماقت پر شرم آ گئی - بے چارے ابا کو پھانسی پر لٹکانے کی ترکیبیں سوچ رہا ہے -

"کوئی لکڑی وکڑی مل جاتی تو ... ..." ابا سوچ میں پڑ گئے - "ہوں .... تمھارے پاس چاقو ہے ؟"

"جی ........" چاقو کے نام سے بیلو زرد پڑ گئے -

"پھر کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو - اماں یار نرے گاؤدی ہو - لاؤ میرا بید -"

بیلو کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا - ابا نے سمجھایا - "بہترین ترکیب یہ ہے کہ باغ میں سے لکڑیاں کاٹ لائیں -"

مارے خوشی کے بیلو کی گھگی بندھ گئی - دونوں باغ میں لکڑیاں ڈھونڈتے رہے - احتیاطاً پانچ چھ لکڑیاں کاٹ لیں - "پٹائی کرنا ہے - کھال تو آدھیڑنا نہیں ہے - کیوں بھئی !" ابا نے پوچھا -

"جی" بیلو نے اتفاق کیا - لکڑیاں لے کر بڑے اہتمام سے کمرے میں پہنچے - افوہ کیا گرمی ہے -"

اماں اور دادی سانس روکے بیلو کے پٹنے کی امید میں کانوں میں انگلیاں دینے کو تیار بیٹھی تھیں تاکہ بیلو کی درد بھری چیخیں نہ سنیں -

"ابھی ہوگی پٹائی ..... گرمی بہت ہے نا ، ابا پانی پی لیں -" بیلو جوش سے سرشار تھے -

"ہا ..... ہا ..... بہت ٹھیک -" پانی پی کر ابا نے گلاس میز پر رکھ دیا اور کسی میگزین میں غرق ہو گئے -

"ابا" بیلو نے نا اُمید ہو کر کہا۔

"کیا ہے؟" وہ ایسے چونکے جیسے سوتے سے کسی نے جگا دیا ہو۔ "جاؤ اپنی اماں کے ساتھ کھیلو۔"

"مگر . . . ." بیلو نے زخمی آواز میں کہا۔

"اوہ . . . ." ابا نے مارنے کی لکڑیاں دیکھ کر پھر اپنے فرض کو یاد کیا۔

پیراگراف ختم کر کے وہ اٹھے۔ لکڑیوں کو بڑے غور سے دیکھا، ہوا میں سٹ سٹ گھمایا۔ پھر تکیے پر مارا، لکڑی ٹوٹ گئی۔ ابا نے بیلو کی طرف غصہ سے دیکھا۔ "اماں یہ تو جامن کی لکڑی ہے بالکل تھرڈ کلاس، دوسری دو"۔ اب کے جو گھما کر ابا نے تکیہ پر لکڑی ماری تو آواز آئی۔ "دھوں۔" یہ تو پورا لٹھ ہے۔

بالکل مر جانے کا بیلو کا بھی پروگرام نہ تھا۔ دوسری لکڑی بے حد کھردری تھی۔ تکیہ کا غلاف نچ گیا۔

اپنی نچی ہوئی کھال اور لہولہان بدن کے خیال سے بیلو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دو لکڑیاں چھ سات وار مارنے کے بعد ہی ٹوٹ گئیں اور ابا تھک کر شل ہو گئے اور ہانپنے لگے۔ جلد سے بیلو نے دوڑ کر پنکھا چلا دیا اور کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر دیا۔ ابا پسینہ پونچھنے لگے۔

"اماں یار ہم تو تھک گئے اور کوئی موزوں لکڑی ہی نہیں ملتی۔ تم بھی تو کچھ کرو۔"

"جی بہت اچھا۔" نہایت فرمانبرداری سے بیلو نے لکڑیوں کو تکیہ پر آزمانا شروع کیا۔ دھوا دھوں دادی اماں نے پٹائی

شروع ہو جانے کی آواز سن کر کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

"بس کیجیے خدا کے لیے ..." روتے ہوئے اماں نے کہا۔ دادی اماں تو بے ہوش ہو گئیں۔

دوسرے لمحہ وہ کمرہ کا نقشہ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ بیلو تکیہ کوٹتے کوٹتے لکڑی ہوا میں لہراتا گیا۔ ابا کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈرے اماں کی طرف شرمندہ ہو کر دیکھتے رہے۔ "وہ — وہ بات یہ ہے، کوئی موزوں لکڑی ہی نہیں ملی ... تو ... بیگم آج نہیں، انشاءاللہ ہم اس مردود بیلو کو اگلی اتوار کو ضرور ماریں گے۔"

دادی اماں نے ہوش میں آ کر گھر سر پر اٹھا لیا۔ بیلو کو کلیجہ سے لگا کر کہہ دیا۔

اگر بیلو کو اس قدر مارا گیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

"مگر بیلو کی تو ابھی تک پٹائی ہی نہیں ہوئی صرف انتظامات ہو رہے تھے۔"

"چولھے میں جائیں ایسے انتظامات، خبردار جو کسی نے بچے کو ہاتھ بھی لگایا تو ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گی۔ ایسا ہی بچہ تم لوگوں کی جان پر بھاری ہے تو اسے یتیم خانہ میں ... ..." وغیرہ وغیرہ۔

مگر حامد میاں نے صرف اتنا سنا کہ آٹھ دس لکڑیاں ٹوٹ گئیں۔ بیلو کی دادی اماں بے ہوش ہو گئیں۔ ایسی شان دار پٹائی تو حامد میاں کی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ بیلو کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے شاگرد استاد کو دیکھتا ہے۔

# ابوالفضل صدیقی

ابوالفضل صدیقی موضع عارف پور ضلع بدایوں کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ مسوری اور دہرہ دون میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وہیں سے سینیر کیمبرج کا امتحان پاس کیا ۔ ان کے والد اور دادا دونوں فارسی اور اردو کے پر گو شاعر اور ادیب تھے ۔ چناں چہ انھیں بھی ادبی ذوق ورثے میں ملا ۔ لکھنے کا شوق طالب علمی کے ابتدائی زمانے سے پیدا ہوا ۔ سنہ ۱۹۳۱ء سے افسانہ نگاری شروع کی ۔

ابوالفضل صدیقی کو قدرت نے حساس دل اور متاثر کرنے والا طرز نگارش عطا کیا ہے جس کے باعث وہ ناول اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے ۔ ان کی تحریر سلیس و شگفتہ ہوتی ہے اور انداز بیان دلکش ۔ ان کے کردار عموماً اسی معاشرے کے چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں ، جس میں ہم اب زندگی بسر کرتے ہیں ۔ وہ ناصح مشفق بننے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ انسانی معاشرتی کمزوری کو نفسیاتی پہلو سے اس طرح اپنے افسانوں میں اجاگر کرتے ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔

بھیا دیوج بھی اسی قبیل کا ایک افسانہ ہے ۔ روایتی

مذہبی رجحان ، رسم و رواج کی پابندی اور راجپوتی آن ، افلاس سے دو چار ہو کر جو نتائج پیدا کرتے ہیں یہ افسانہ ان تمام باتوں کو بڑے دلکش انداز میں پیش کرتا ہے -

ابوالفضل صدیقی کے مشہور ناول " تعزیر " اور " سرور " ہیں - اور ان کے افسانوں کے مجموعے " احرام " " دن ڈھلے " اور " شکنجے " ہیں - ناول اور افسانوں کے علاوہ انھوں نے ایک کتاب " رموز باغبانی " بھی لکھی ہے - سنہ ۱۹۵۷ء میں پی - ای - این نے افسانوی ادب کے ایک انعامی مقابلے میں ابوالفضل صدیقی کو ایک ہزار روپیہ کا انعام ان کی کہانی " چڑھتا سورج " پر دیا -

ناول اور افسانہ نگاری کے علاوہ شاعری ، باغبانی اور شکار ان کے محبوب مشغلے ہیں ، اور آن کی تحریروں میں ان مشغلوں کی جھلک پائی جاتی ہے - ان کے افسانوں میں دیہات کی زندگی ، زمینداروں کی آن بان ، شکار کی کہانیاں ان کی اپنی شخصیت کو اجاگر کرتی ہیں - انھوں نے اس ماحول کا گہرا مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے - اسی لیے ان کی کہانیاں زندگی سے بہت قریب آجاتی ہیں -

# بھیا دیوج

## (۱)

گوبردھن سنگھ کھرے چوہان تھے مگر ان کے ماضی کی مضبوط رسیوں کا سایہ مدتیں ہوئیں ان کے حال سے کٹ گیا تھا اور وہ خالی چوہان رہ گئے تھے اور سنا کرتے تھے کہ بوڑھی گنگا کی تڑنیٹی سے بڑی گنگا کی کٹری تک دس کوس لمبے چوڑے دنگل میں ان کے باپ دادا پردادا کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور توے کی جھنکار بیس بیس کوس تک جاتی تھی اور پھر یہ بھی سنا ہے کہ بڑے بڑے محال پٹیاں، معافیاں نان کاریں ان کے دادا کی زندگی ہی میں مہاجن کے قرضے میں نیلام ہو گئے اور لاکھوں کی جائداد کوڑیوں میں سود بیاج میں نکل گئی اور پھر یہ بھی سنتے چلے آرہے تھے کہ ان کے دادا نے لڑکی کی شادی میں مہاجن سے ایک ہزار روپیہ قرض لیا تھا جس کے سود در سود کے چکر میں باپ کے وقت تک پہنچتے پہنچتے ایک لاکھ کی مالیتی جائداد برابر ہو گئی اور گوبردھن سنگھ نے دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ یہ بھی سنا ہی تھا کہ لمبی چوڑی آبائی سیر خود کاشت کے سینکڑوں ایکڑ زرخیز رقبے جو زمینداری نکل جانے کے بعد ساقط الملکیت کے ضمن میں آگئے تھے بنئے، زمیندار کی بقایا لگان کی نالشوں میں بے دخل ہو گئے۔ جن کے ساتھ اونچے اونچے گھوڑے گھوڑیاں، بڑے بڑے بیل، دودھار گائیں، بھینسیں سب

کے سب باپ کے آخر زمانہ میں ہی اپنے پاؤں چل کر گھر خالی کر گئے اور گھر کے اندر جانور کے نام گوبردھن سنگھ کے ہاتھ چوہے کا بچہ بھی وراثت میں نہ آیا اور رہے سہے بے مرمت لق و دق مکان نے آبائی قرضہ کا آخیر حصہ چکانے میں نیلام ہو کر گوبردھن سنگھ کو نکال باہر کیا اور اب وہ ایک جھونپڑے میں رہتے جو کسی زمانہ میں ان کے دادا کے مویشی خانہ کا ایک دور افتادہ اور بے کار حصہ تھا جس کے اندر قانون نے انھیں مکان نیلام ہونے کے بعد زندگی بھر حق رہائش دیا تھا اور عنفوان شباب سے لے کر آج چالیس کے پیٹے میں آگئے اور اسی چھپر میں بس رہے تھے اور انھیں اپنے حال کے متعلق صرف اتنا یاد تھا کہ وہ ایک مزدور ہیں۔

اور مزدور ہو کر بھی اور سب کچھ بھول بھلا کر گوبردھن سنگھ کو اچھی طرح یاد تھا تو یہ کہ وہ کھرے چوہان ہیں۔ " دلی والے " جنھوں نے محمد غوری کو بیچ میدان بھگایا، جے چند کو نیست و نابود کیا، آلھا اودل ملکھان سے بیر پالے، پھر روہیل کھنڈی چوہان! حافظ جی (حافظ رحمت خاں) کے سیدھے بازو! جن کے بل پر روہیلے، فرنگی اور شاہ اودھ " ایک للکار ڈانٹے دلی پر چڑھ دوڑے۔"

اور اس سنی سنائی کو محفوظ کیے ٹھا کر گوبردھن سنگھ اب تو بیس سال سے اسی " دنگل " میں تیرے میرے کھیتوں کے اندر دو آنہ روز کی مزدوری کر رہے تھے، جہاں اب سے چالیس سال پیشتر ان کے باپ دادا کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور ان کے بہادر پرکھے پورب کو منہ کر دیتے تو پروائی دم سادھ جاتی اور پچھم کو نگاہ اٹھا دیتے تو چڑھی آندھیاں کٹ کر نکل جاتیں اور ان کے زمانہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے دو چار بڈھے اب بھی

دیہات میں باقی تھے جو گوبردھن سنگھ کو کھیت کھیت دو دو آنہ کی مزدوری کرتے دیکھ کر اس کے ماضی کے حالات بتاتے اور اپنی اولاد کو عبرت دلاتے۔

باپ کی زمینداری ، سیر خود کاشت ، اثاث البیت ، دولت سب کچھ باپ کی زندگی میں ختم ہو گئی تھی۔ ایک بہن تھی ، جس کو وہ اچھے گھر بیاہ گئے تھے۔

اور انھوں نے اپنی ٹھکرائیت کے بھاری بھرم سے گوبردھن سنگھ کو بھی اچھے گھر بیاہا تھا۔ اور گوبردھن سنگھ کے سسرال والوں نے بہتیرا چاہا کہ وہ گھر جوائی بن کر رہیں مگر انہیں پرانی مثل یاد تھی کہ ساس گھر جوائی سو کتا اور نتیجہ علیحدگی ہوا اور علیحدگی کیا بیاہ کے بعد گونے دونے کی صورت ہی نہ آپائی اور بھلا ایسے گھر میں کوئی کھاتے پیتے گھرانے کی راجپوتنی کیسے گزر کر سکتی تھی ، کرموں جلی ، اور اصرار بھی کرتے تو گوبردھن سنگھ کس برتے پر۔ ان کے پاس کیا تھا ، ایک کھرپی۔ اور وہ صبح تڑکے دھوتی کے پیچ میں کھرپی لگا کر نکلتے ، خیر کھرپی اور زمین کا بھی ازلی رشتہ ہے جو چلا آتا ہے مگر راجپوت اور زمین کا بھی ازلی رشتہ ہے۔ اور جب ساری دھرتی پر کہیں کونڑ بھر زمین کے مالک نہ تھے تو گوبردھن سنگھ کاہے کے راجپوت تھے۔ آپ اپنے منہ میاں مٹھو بنا کریں مگر دنیا انہیں راجوت کیسے تسلیم کر لیتی۔ حتیٰ کہ سگی جورو تک نے تسلیم نہ کیا۔

اور گوبردھن سنگھ چوہان گڑھ میں نہ لگے تو دو دو چار چار کوس چاروں طرف دیہات میں کسی دخیل کار موروثی کاشت کار کے کھیت پر مزدوری کرتے اور مزدور چماروں اور لودھوں کے ساتھ

کہیں نہ کہیں کام پر جٹے دکھائی دیتے۔ مگر یہاں بھی اپنی ٹھکرائیت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ چماروں اور لودھوں سے ڈیوڑھا کام کر کے دکھاتے اور مالک کو ان کو ٹوکنے کی بجائے الٹی تواضع اور تعریف کرنی پڑتی اور بار بار چلم پلایا جاتا۔ یہاں پر انہیں ایمانداری کا خیال کم رہتا بلکہ وہ اپنی ٹھکرائیت کی لاج کو ڈرتے کہ کہیں ان کی پیٹھ پیچھے مالک یہ نہ کہے کہ چلو ٹھاکر ہیں، بےچارہ کا وقت بگڑ گیا ہے جو کچھ کریں۔ دوسرا خیال ان کے دماغ میں یہ آیا کہ میرے ساتھی مزدور سب چمار لودھے نیچ قوم کے ہیں اور اگر یہ مجھ سے زیادہ یا میرے برابر بھی کام کر دکھائیں تو میری ٹھکرائیت کاہے کی ہوئی۔

اور شام کو دو آنہ پا کر گوبردھن سنگھ کتنے مطمئن، کس قدر خوش نظر آتے! شاید ان کے دادا ربیع خریف اپنی تحصیل لگان کر کے اتنے خوش نظر نہ آتے ہوں گے اور ان کی بہن جنکا اپنے شوہر سے فصل کے فصل ہزاروں روپیہ کی پوٹ ہاتھ میں لے کر اتنی مطمئن نہ ہوتی ہوگی۔

اور جنکا کا شوہر ایک متوسط خوشحال زمیندار تھا جس کے یہاں سبھی کچھ تھا اور سالے کی حالت سے کچھ کچھ واقف بھی تھا اور اس کی پچھلی خاندانی روایت تو آج تک زبان زد خاص و عام تھیں۔ ہمیشہ شکایت کیا کرتا کہ ددا (بڑے بھائی) نے کبھی ہمارا ہاتھ نہ بٹایا۔ اگر فصل کی تیاری کے ہی وقت آ کر سیر کے کھیتوں پر پندرہ دن کھڑے ہو جایا کریں تو سال بھر میں مزدور نوکروں کی چوری سے ہم کو اتنا بچ رہا کرے کہ ددا دو تین برس میں نہ کھا پائیں اور جنکا کو کبھی کبھی بھائی کی حالت اور پچھلی روایات کا اندازہ کر کے اپنا عیش اور دولت بے کیف

معلوم ہوتی۔ شوہر کے بار بار اصرار پر ایک مرتبہ جنکا نے گوبردھن سنگھ سے اپنے یہاں مستقل طور پر چلے آنے کی تحریک بھی کی۔ خیر بہنوئی کی بات تو ہمیشہ گوبردھن سنگھ نے ہنس کر ٹالی مگر جنکا کی تحریک پر بڑی لال پیلی آنکھیں دکھائی۔ " ہوں نادان لونڈیا اپنے باپ دادا کی ناک اپنے ہاتھ سے کاٹتی ہے، شرم نہیں آتی تجھ کو۔ " بہن کے گھر بھائی سو کُتّا " پرانے پرکھے کہہ مرے ہیں، تو کیا تیرا بھائی کتا ہو کر جیے۔ مجھے تو ڈوب مرنا اچھا ہے بہن کے در پہ جا کے رہنے سے۔"

مگر جب کبھی جنکا کی ساس نندیں طعنہ دیتیں کہ بڑی ٹھکرائن بنتی ہو اور بھیا ٹکے ٹکے کی مزدوری کرتے پھرتے ہیں تو جنکا اکڑ کر جواب دیتی : "مزدوری ہی تو کرتے ہیں بھیک تو نہیں مانگتے، ڈکیتی تو نہیں مارتے اور تمھارے دروازے پر کس دن مزدوری کرنے آئے ہیں۔" اور یہ کہہ کر جنکا اپنے آپ کو فتحمند محسوس کرتی، جیسے اس کے بھائی کی حیثیت اس کے شوہر سے ذرا بھی کم نہیں ہے۔

( ۲ )

اور اپنے جھونپڑے کے دروازے پر ارہر کی لکڑیوں کی ٹٹی چڑھا کر منہ اندھیرے کا نکلا گوبردھن سنگھ سر شام پلٹتا اور اپنی دونوں وقت کی روٹی خود پکاتا اور صبح کو رات کی رکھی ہوئی باندھ کر ساتھ لے جاتا اور سب مزدوروں کی روٹی ان کی عورتیں دوپہر کو لاتیں اور اپنی رات کی پکی ہوئی کی پوٹلی کھول کر دوپہر کے وقفے میں گوبردھن سنگھ کھاتا۔ دوپہر سے پہلے کام والا بھنے ہوئے چنے کا چبینا تقسیم کرتا جو دو آنہ یومیہ کے علاوہ مزدوری کا جزو ہوتا۔ گرمیوں میں

رات کا پکا ہوا کھانا دوپہر تک خراب ہو جاتا ہے ۔ اس لیے جاڑوں جاڑوں تو گوبردھن سنگھ باسی کھانا کھا لیتے اور گرمیوں کے موسم میں اسی چبینے پر اکتفا کر کے دن کاٹ دیتے ۔ تمام دن گوبردھن سنگھ کا جھونپڑا سنسان پڑا رہتا ۔ شام کو کبھی کبھی جمی جولاہے ، نرائن تیلی ، بلالی مراؤ ، جیے رام گڈریا آبیٹھتے ۔ الاؤ کے گرد آدھی رات تک گپ ہوتی ، چلموں کا دور چلتا ۔ اور اپنے تنہائی پن اور افلاس کے اعتبار سے گوبردھن سنگھ کا جھونپڑا بستی بھر میں اپنی نوعیت کا ایک تھا ۔ مگر سال میں ایک دن ایسا بھی آتا جس روز یہ تاریک ویران جھونپڑا چمک کر چہچہا اٹھتا اور صنف نازک کے لہجہ کی جل ترنگ گونجتی سنائی دیتی ، جب بھیا دیوج پر جنکا ٹیکا کرنے اور مٹھائی سے منہ بھرنے سال کے سال آتی اور بھیا دیوج کا محبت اور خلوص سے پر تیوھار جس روز بہن بھائی کے تلک لگاتی ہے ، منہ مٹھائی سے بھرتی ہے اور پھر اپنے بھائی کے اوپر سال بھر میں آنے والی سب بلائیں ، ساری مصیبتیں ، کل بیماریاں اپنے لیے مانگتی ہے اور پھر اپنی عمر و تندرستی اپنے بھائی کو مل جانے کی دعا مانگتی ہے اور یہ ساری دعائیں شیریں گیت کی آوازوں میں مانگی جاتی ہیں ۔ بھائی بہن کو اپنی حیثیت کے مطابق دان دیتا ہے ۔ مٹھائی کے بدلے میں مٹھائی یا اس کی قیمت دیتا ہے اور آنے جانے کا کرایہ دیتا ہے اور دو تین روز ٹھہرا کر دعوت کرتا ہے ۔

بھیا دیوج کے دن بالعموم بیویاں گھر چھوڑ چھوڑ کر میکے چلی جاتی ہیں اور گھر گھر بیویوں کے بجائے بہنوں کا انتظام ہوتا ہے اور ہر بیوی آج کے دن بیوی نہیں ہوتی صرف بہن ہوتی ہے ۔

جنکا کا گاؤں راٹھور نگر چوہان گڑھ سے چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور ریلوے اسٹیشن سے کوس بھر کے فاصلہ پر آباد تھا - بھیا دیوج کے دن صبح تڑکے کی گاڑی سے جنکا روانہ ہوتی ، راٹھور نگر سے اسٹیشن تک رتھ میں کوس بھر کا فاصلہ طے کرتی اور پھر سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیتی - ایک معتبر کارندہ اور ایک معتمد مہری اور ایک کہار تین آدمی ساتھ ہوتے - ریلوے اسٹیشن سے چوہان گڑھ تین کوس تھا - کارندہ تو حسب معمول ہدایات کے مطابق اسی ٹرین سے شہر چلا جاتا اور جنکا مہری اور کہار کو اسٹیشن پر ہی چھوڑتی اور گھٹیا سی سوتی ساڑی باندھتی اور پیدل چوہان گڑھ روانہ ہو جاتی اور تین کوس کا فاصلہ اس لیے طے کرتی کہ سفر میں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم بندھا بندھا سا ہوتا - راستہ میں چوہان گڑھ کے لوگ آتے جاتے اور ارد گرد کھیتوں پر کام کرتے ملتے جنھیں وہ مخصوص بہن اور بیٹی والے انداز میں سلام کرتی چلتی -

جنکا چھوٹی سی مٹھائی کی پوٹلی ہاتھ میں میں لٹکائے بھیا کے گھر پہنچتی اور آج گوبردھن سنگھ اس دن کے لیے مدتوں کا رکھا ہوا مخصوص جوڑا نکالتے - کالی کنار کی دھوتی دو پیچ لگا کر خوب لنگ چڑھا کر اور کس کر باندھتے ، اوپر سے اچھی سفید پھتوئین پہنتے اور سر پہ بڑا سا پگ باندھتے - راجپوتی انداز میں خوب مونچھیں چڑھا کر بیٹھتے ، ترچھے ترچھے بھاری بھرکم بنے - اگرچہ ان کی سج دھج اور بہروپ میں راجپوتی انداز ہوتے مگر تیوروں میں آزاد مزدور والے دم خم جھانکتے اور عجیب شان استغنا نظر آتی - بہن کو دیکھ کر کھل اٹھتے اور جنکا رواج کے مطابق تلک لگاتی اور منہ میں مٹھائی کی ڈلی دیتی اور پھر اس کی بلائیں لے کر ساری بیماریاں اور مصیبتیں اپنی

جانب آجانے کی پرارتھنا گاتی جس کی تان اپنی عمر و تندرستی اپنے بھائی کو مل جانے پر ٹوٹتی -

پھر بڑے مخصوص انداز میں گوبردھن سنگھ اُٹھتے ، اپنی کٹھار کی کھڑکی کھول کر اندر گھس جاتے - گھی ، میدہ ، آلو نکالتے ، جیسے بھری کٹھار میں سے ایک وقت کے کھانے کے قابل نکال رہے ہیں اور جنکا بڑے اہتمام سے پوری کچوریاں آلو تیار کرتی اور ان کے سامنے پروستی اور انھیں کھلانے کے بعد خود کھاتی اور رخصت ہونے لگتی - رخصت کے وقت راٹھور نگر کے اسٹیشن سے چوہان گڑھ کے اسٹیشن تک کا تھرڈ کلاس کا کرایہ بتاتی اور کہتی کہ میں اکیلی آئی ہوں - چار آنے کی مٹھائی بتاتی ، دو آنے کا تلک کا چندن سیندور ، یہ رقم تین چار روپیہ بنتی - پھر جسم پر موٹی دو ڈیڑھ روپیہ والی ساڑھی باندھے ہوئی اور ویسی ہی ساڑھی کے دام مانگتی اور سب حساب پانچ چھ روپیہ کا ہوتا اور گوبردھن سنگھ یہ رقم ہاتھ پر رکھتے جسے پاکر جنکا ایسی خوش ہوتی جیسے اس کے بھائی نے ہفت اقلیم کی دولت اس کے ہاتھوں میں دے دی ہے - افلاس کے ہاتھ کا بخشا ہوا دان دولت کے ہاتھوں میں پہنچ کر ہیرے کی طرح چمکتا اور اس لین دین کے وقت تمام رسمی تجاہل عارفانہ برتے جاتے -

اور سہ پہر کے بعد جنکا اسٹیشن پہنچتی ، اتنی دیر میں اس کا معتبر کارندہ شہر سے پلٹ چکا ہوتا - ریشمیں بڑھیا ساڑھی ، مہری ، کہار کے موٹے اور اپنے باریک اچھے کپڑے اور مٹھائی کا ٹوکرا لیے ہوئے جنکا اپنی موٹی ساڑھی اتار کر نئی ریشمیں ساڑھی بدلتی - کارندہ ، مہری ، کہار اپنے اپنے کپڑے پہنتے

اور جنکا سجی بنی سسرال پہنچتی ۔ ساس ، نندیں دیکھتیں ، شوہر دیکھتا کہ کتنے زور کی بھیا دیوج کرتا ہے گوبردھن سنگھ ۔ اور بالعموم بنارسی ساڑھی دیکھ کر شوہر بول پڑتا " ددا پرانے آن والے ٹھاکر ہیں کچھ نہ رہا مگر بہن کو لیتے دیتے وقت رئیس بن جاتے ہیں " اور اس کی ساس لقمہ دیتی " پرانا چوہان گھر ہے ۔ بات پر مٹنے والے چوہان " اور کوئی نند کہتی " اور مٹھائی تو دیکھو ، پچرنگی ٹوکرا بھری ۔ "

" ہوں یہی تو میں کہتا ہوں ، دیکھو تو اماں ٹھکرائیت ان کی سچی ہے ۔ دانت پر میل نہیں اور بہن کے لیے یہ ٹھاٹھ ، سامان ۔ مہری ، کہار سب کی پہناؤنی کرتے ہیں ۔ منشی جی کو مخملی کناری کی دھوتی اور بوسکی کی قمیص دی ہے ۔ ٹھاٹھ سے پہنے بیٹھے ہیں باہر چوپال کے چبوترہ پر ۔ "

اور جنکا بٹوے میں سے نکال کر وکٹوریہ کے سکہ کے اکیاون روپیہ دکھاتی " اور اکیاون روپیہ ۔ " " ہمت والے لوگ ہیں ، جائداد ، سیر ، دھن سب ختم ہوگیا پر آن وہی ہے ۔ "

" اری چھوکری چھوکرو تم کیا جانو ہم جانتے ہیں ان چوہانوں کو ۔ ہمت کے لوگ ہیں اور لینا دینا ہمت کے ہاتھ کی بات ہے اور گوبردھن کے پاس تو باپ دادا کے زمانہ کا دبا دبایا پڑا ہے ۔ یہ روپیہ نہ دیکھو ، گڑے ہوئے کھودے ہیں ۔ جی دار ٹھاکر بچہ ہے ، جان جائے آن نہ جائے ۔ کوئی بڑا بکرماجیت و رئیس ٹھاکر اس سے اگلی اور کیا کرے گا ۔ " ساس کہتی ۔ اور جنکا خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی ۔ جیسے یہ سب کچھ سچ مچ اس کے بھائی نے دیا ہے ۔ یوں تو ساس نندوں کا گھر تھا مگر جنکا جیسے اس سامان سے سال بھر تک سب گھر پر

حاوی ہو جاتی - جیسے برابر کے ٹھاکر گھر کی بیٹی -

(۳)

اور بھیا دیوج کا ڈیڑھ مہینہ باقی تھا - ساڑھے دس مہینے کے پیسہ روز سے پس انداز کیے ہوئے پانچ روپے کے تانبے کے پیسے گوبردھن سنگھ کے پاس تھے اور ڈیڑھ ماہ میں انھیں دو ڈھائی روپے اور جمع کرنے تھے - تمام دن مزدوری کرتے اور شام کو کسی کسان کے یہاں سے مونجھ کے گٹھے اٹھا لاتے اور آدھی رات تک اپنے اکیلے مکان میں پانی لگا لگا کر انھیں کوٹتے - کہیں سے پرانے سن کے پولے لے آتے اور انھیں توڑ توڑ کر سن علیٰحدہ کرتے اور ملا ملا کر باندھ بٹتے اور دوسرے تیسرے دن باندھوں کے وزن کے برابر مکا ساٹھی مل جاتا اور اس طرح رات کے چند گھنٹے کے کام میں چار چھ پیسے روز کے سر ہو جاتے - اور اس طرح انھیں بھیا دیوج کے پر خلوص دن کے اخراجات کی فراہمی میں محنت کرتے پندرہ دن ہوگئے تھے اور اب وہ مطمئن تھے کہ آخر ماہ میں فاقے کرکے پس انداز نہ کرنا پڑے گا - ویسے سال بھر میں بارہ مہینہ ہر دن تو مزدوری لگتی ہی نہ تھی ، لیکن اور مزدوروں کی طرح جس دن مزدوری نہ لگتی وہ گھر نہ بیٹھتے ، کھرپی لے کر ہری ہری دوب پر پھسل پڑتے اور شام تک دو آنے کی نہیں تو پانچ چھ پیسے کی گھاس چھیل کر بیچ ہی لیتے اور جب بارش کی وجہ سے کچھ بھی نہ کرسکتے تو اطمینان کے ساتھ فاقہ کر لیتے مگر بھیا دیوج کے فنڈ کو پورا کرتے رہتے - ان کا دائرہ بہت چھوٹا تھا مگر دائرہ کے اندر رہنے کا سلیقہ بہت وسیع - روز کا کنواں کھودتے اور روز کا پانی پیتے اُن کی زندگی کے پچیس سال کٹے

تھے۔ ان پچیس سال میں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا تھا۔ کسی زمین سے ان تعلق باقی نہ تھا۔ اور ان کے باپ دادا کا جانشین بیٹا زمیندار انھیں جانتا بھی نہ تھا، مگر وہ اسے خوب جانتے تھے کیوں کہ انھی کے قرضہ میں ان کی آبائی زمینداری نیلام ہو کر اسے پہنچی تھی۔ جیسے اس کے بھاری کولھوں اور موٹی توند کے اندر سود در سود کی دھونکنی سے ٹھکرائیت کی روح پھنک گئی تھی۔ جیسے گئو کا ماس کھاکھا کر اس کے اوپر یہ گوشت چڑھا ہے۔ اور ایک دو آنہ یومیہ کمانے والے مزدور کی نگاہیں اس پر انھیں جذبات کے ساتھ پڑتیں۔ اور حلقہ کا مہاجن تو ان لوگوں سے واقف تھا جن کے پاس الٹ پلٹ اور لین دین کے کچھ مادی سامان تھے اور گوبردھن سنگھ کے پاس نہ دامن تھا اور نہ خار سے اُلجھتا تھا۔ البتہ اس کا بھیا دیوج کا حقیر دان ایسے ایسے نہ معلوم کتنے سامانوں پر بھاری تھا جو اس کی بہن کارندہ اور ملازموں کی سازش سے گھر جا کر دکھایا کرتی تھی۔

اور آج صبح گوبردھن سنگھ یہ سوچ کر گھر سے نکلے کہ زمیندار بھٹہ لگوا رہا ہے۔ روزانہ کی مونج اور سن کی کٹائی میں تو بڑی محنت بھی پڑتی ہے اور بہت تھوڑا ہاتھ آتا ہے۔ اگر رات کا کام بھٹہ پر مل جائے تو ہفتہ ہی بھر کے اندر بھیا دیوج کے خرچ کے قابل جمع ہو جائے۔ لٰہذا دریافت حال کے لیے جمی جولاہے کے گھر میں گئے۔ وہاں اور ہی رنگ دیکھا۔ جمی جولاہے ایک بقر قصاب کے ساتھ کھڑے تھے اور جمی جولاہے کی اوسر گھر کے دروازہ کے قریب زمین پکڑے پسری ہوئی تھی اور بقر قصاب رسی پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا تھا اور پیچھے سے جمی جولاہے ٹخ ٹخ کر کے اُٹھا رہے تھے مگر اوسر کسی صورت زمین نہ چھوڑتی تھی

اور زیادہ ٹخ ٹخانے پر گردن ہلا ہلا کر گویا جانے سے انکار کرتی تھی۔

گوبردھن سنگھ پہلی ہی نظر میں سمجھ گئے اور آہستہ سے جمی جولاہے کے کان کے قریب منہ لا کر بولے "کیوں چاچا ایسی اچھی گھر کی بچھیا کیوں کٹائے دیت ہو۔"

جمی جولاہے محجوب سے ہو گئے اور گردن جھکا کر زیرلب بولے "بیٹا اپنے بس کٹائے دیت ہوں۔ لالہ جی (زمیندار) کا لگان ٹوٹ رہا۔ بیدکھلی (بیدخلی) کا نوٹس دیا ہے۔"

"تو پھر کٹانے سے کیا نتیجہ، لالہ جی سے کہو کہ لے لیں اپنے مطالبے میں" گوبردھن سنگھ نے کہا۔

"ارے بیٹا بہتیری کہی، شاما بچھیا ہے، کہانے پئے سگھڑ گانے بنے گی، پر ناہیں مانو، کہت ہے کہ ہم کیا کریں گے۔ ہمیں گائے ناہیں چہے۔ ہمارا لگان دیو۔ ہمیں گایوں کا باڑھا بنانا ہے کہ جمینداری (زمینداری) کرنا ہے۔"

"تو کتے میں کٹانے دیت ہو چاچا" گوبردھن سنگھ نے رقت کے ساتھ کہا۔

اور اس سے زیادہ رقت کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھر کر جمی جولاہے بولے "پانچ روپیا میں بیٹا" اور ایک مسلمان کی آنکھوں میں اپنی گئے کٹانے پر مجبوری کے آنسو دیکھ کر ٹھاکر کے خون میں جوش آگیا اور گوبردھن سنگھ بولے "پھر تم کہی نائے اس بنیے (زمیندار) سے کہ کسائی (قصائی) لیئے گو۔"

"ہاں بیٹا سب کچھ کہی پر اس نے وہی اپنے مطلب کی

گھی۔ تم جانو، مت دیو کسائی کو، پالو دودھ کھاؤ، ہمارا مطالبہ ہمیں دیو۔"

گوبردھن سنگھ دانت کٹکٹا کر بولے۔ "بنیا سالا ویش بنت ہے (ویش بنتا ہے) اور ٹھکرائیت کرتا ہے۔ کسائی ہے کسائی، بھگوان نے حکومت زمینداری دے دی اس کے ہاتھ میں! اے مالک تیری لیلا!" اور بڑ بڑاتے ہوئے گوبردھن سنگھ نے چلنے کا اندازہ بتایا۔ ایک نظر ڈالی تو اوسر (بچھیا) کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ مجبور نگاہوں کی شعاعیں ملتجی آنکھوں سے جا ملیں اور ساتھ ہی حلق سے آواز اوسر نے گائے سے زیادہ کچھ آدمی سے ملتی جلتی نکالی اور آنکھوں سے رہی سہی سب کچھ اس کی آواز میں کہہ دی اور اس آواز پر جیسے ایک ذہنی ترنگ کے ساتھ گوبردھن سنگھ نے اچھل کر پھر اوسر کی جانب دیکھا اور انھیں ایک دھچکا سا لگا۔ گائے کی معصوم خوب صورت ہرنی جیسی آنکھوں کی کرنٹ راجپوت کی بہادر آنکھوں سے مل گئیں اور جیسے دو ڈائینمو کی لہریں ایک دوسرے سے سلسلہ ملانے لگیں، جیسے ان کے شعور نے ہزاروں سال پرانی کہانی دہرا دی۔ وہ بے خود ہوگئے اور ان کے جذبات کا رشتہ ماضی و مستقبل دونوں سے منقطع ہو گیا اور جیسے بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے اور بلا ایک نظر آگے اٹھائے ساڑھے دس مہینہ کا بھیا دیوج کا اندوختہ قصائی کے حوالہ کیا اور رسی ہاتھ میں پکڑ لی اور اوسر تو منتظر بیٹھی تھی، گوبردھن سنگھ کے رسی پکڑتے ہی اچھل کر کھڑی ہوگئی اور یا تو جمی جولاہے کے گھر کے دروازے پر زمین کا گز ہی بن کر چکی ہوئی تھی یا گوبردھن سنگھ کو گھسیٹتی ان کے گھر کی

جانب دلکی بھاگی جارہی تھی اور ان کے گھر ہی جاکر کھڑی ہوئی۔

گوبردھن سنگھ کے بے آب و گیاہ زندگی کے میدان میں کبھی صنف نازک داخل نہ ہوئی تھی۔ بچپن کی ماں کی آغوش فراموش کر چکے تھے، جوانی بیوی کی خوشبو سے آشنا نہ ہوئی تھی۔ سال کے سال بہن صبح کے ستارے کی طرح چمک کر سال بھر کے لیے غائب ہو جاتی اور ایک سرور سا گوبردھن سنگھ کی آنکھوں میں چھوڑ جاتی، جس کے سہارے ان کے اندر جمالیاتی احساس کی جھلک آئندہ بھیا دیوج تک باقی رہتی اور بھیا دیوج کی تیاری میں انھیں سال کے بارھوں مہینے کا ہر دن گزرتا اور ان پر مستقل سرور سا رہتا۔ آج ان کی زندگی میں گائے داخل ہوئی تھی اور گائے بھی جوان، اوسر اور پھر شیاما! یک رنگ، بے داغ چمکتا ہوا سیاہ رنگ، رونگٹے پر ایسی چمک جیسے گھی ملے ہوئے ہے۔ عضو عضو قدرتی پروش اور سانچہ میں ڈھلا ہوا۔ کھر سے لے کر سینگ تک ہر چیز پر بالیدگی سی اچھلتی ہوئی، انگ انگ پر زندگی کے سوتے ابلتے ہوئے۔ گائے تھی کہ بندرابن سے خاص کنھیا جی کے گلے کی نکلی ہوئی دیوی۔ دودھ گھی کی نہروں کا خزانہ اپنے اندر چھپائے ہوئے اور بڑے لمبے چوڑے رقبوں کی کاشت کے جانوروں کا گلہ بنی ہوئی، مگر ذرا ہی دیر بعد یہ نشہ خمار بن گیا اور آج سے چالیس روز بعد بھیا دیوج کا دن ان کے سامنے کھڑا تھا اور جوں جوں دن گزرتے شیاما انھیں شیرنی سی نظر آنے لگی۔ ان کی ساری روایات، سات پشت کی ساکھ ہڑپ کرتی معلوم ہوتی۔ اور اوسر گائے سے تو بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہوا کرتی ہیں۔ اور آج شیاما تو ان کے لیے گرم دودھ بن گئی تھی۔ اور بھیا دیوج کا ایک ایک دن کم ہو رہا تھا۔ دور دور فراہمی زر کی شکلیں

نظر نہ آتی تھیں ۔ گوبردھن سنگھ کی رات کی نیندیں اڑیں ، دن کا سکون گیا ۔ لائیں تو کہاں سے لائیں اور مانگیں بھی تو کس برتے پر اور کس سے ۔ اور اس طرح بس روز گزرے اور بیس دن ہی کی پرورش میں شیاما رنگ پر آگئی اور کھلی رہی ۔ کسی خوش نصیب کے تھان پر شیاما اوسر گابھن ہوتی ہے ۔ کوئی دوسرا ہوتا تو خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا مگر گوبردھن سنگھ پھلوڑھا شیاما کے مالک ، فکر میں گھل رہے تھے ۔ تقدیر دیکھیے جمی جولاہے اسے خالی سمجھ کر قصائی سے کٹا رہے تھے ، زمیندار نے بیکار بچھیا خیال کر کے لگان میں لینی پسند نہ کی تھی ، گوبردھن سنگھ کے تھان پر بیس دن میں ہی گابھن کھل گئی ۔ مگر ع :

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

— — دودھ دے گی ، گھی دے گی ، بچھڑے دے گی ، مگر جب تک گوبردھن سنگھ کی پچیس سال کی بنی بنائی کرکری ہو چکی ہوگی ۔ بھیا دیوچ پر ان کی بہن آئے گی اور وہ خالی ہاتھ ہوں گے ۔ اور ان کا دم گھٹنے لگتا ۔ برسات گزر کر کنوار آلگا تو ہری ہری پکی دوب چر چر کر شیاما جیسے یک دم پہاڑ سی گائے بن گئی ۔ یہ بڑا پیٹ ، بھرے ہوئے مٹکا سے تھن اور بدن میں چستی اور تن دہی ، چال میں نشہ سا ۔ اور کبھی کبھی گوبردھن سنگھ گابھن گائے کو دیکھ کر سوچتے ، کیسا پاپ بچا ! کیسی اچھی شیاما گئو اور گابھن قصائی کی چھری سے کٹتے کٹتے بچی ، مگر اتنے پن کے احساس سے بھی وہ اپنے دل کو نہ سمجھا سکے ۔ وہ تو بھیا دیوچ کا تیوہار سانپ کی طرح لہراتا بڑھ رہا تھا ۔ اور جس قدر شیاما دن دوگنی رات چوگنی ہوئی ، اتنے گوبردھن سنگھ گھٹے اور گھلے ۔ اور ایک شام گوبردھن سنگھ جنگل

سے ہنکا کر شیاما کو لا رہے تھے ، بستی کے قریب حلقہ ساہوکار گاؤں سے واپس جا رہا تھا۔ گوبردھن سنگھ کی گئیے کو دیکھ کر ساہوکار نے اپنا ریہہ روک لیا۔ سلاموں کے تبادلہ کے بعد ساہوکار نے کہا۔ "ٹھاکرو بڑی اچھی شیاما پالی ہے۔" "ہاں ساہو جی پالی کیا سر پر پڑ گئی ہے۔ جمی جولاہے کو لگان کے لئیں پانچ روپیا کی جرورت تھی سو وہ کٹانے دیت تھے۔ میرے پاس پانچ روپیہ کاؤ کی دھرو (کسی کی امانت) کے رکھے تھے ، میں نے اٹھانے کے دے دیے۔ اب تو جے گلا میں اٹک گئی ہے۔" "ہوں پانچ روپیہ دے کر ہچ س کا مال بھی تو نے مار لیا۔ ایسی اوسر اور پھر شیاما ، کسی تقدیر والے کے ہاتھ لگتی ہے۔ گھر بھر دے گی گھر ، آدھے گابھ سے اوپر نکل گئی۔ بس اب لیے دن چار مہینہ بعد۔"

اور چار مہینہ کا لفظ گوبردھن سنگھ کو چار لوک سنائی دیا۔ آہستہ سے بڑ بڑائے۔ "پھر ساہو جی چار مہینہ کسے لے ملیں گے ، جس کی دھرو ہے وہ تو آج مانگتا ہے۔ میرے لیے تو اس کی کھربداری مصیبت بن گئی۔"

"ارے ٹھاکرو کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ تو دودھار گائے ہے، مثل میں کہی جاتی ہے۔ پھر شیاما ! اس کا دودھ امرت ، اس کا گھی آب حیات! ملتا کسے ہے شیاما کا گھی دودھ۔ بولو میں دوں کتنے چھئیں ؟ پھر صاف بات جے ہے کہ پورے بیانت کا گھی دودھ میں کھاؤں گا اور بھاؤ آج طے کروں گا۔ بولو کتنے روپے ؟"

"مگر ساہو جی مثل تو جے بھی ہے کہ گابھن گائے کس نے دیکھی۔"

"اپے ہم نے دیکھی" اور یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ

ڈالا اور بولے ''کتنے روپیا دوں؟'' اور اب انکار کرنا دودھ بھری تھالی میں لات مارنا تھا۔ ''سات روپے'' گوبردھن سنگھ کے حلق سے اٹکتی ہوئی آواز نکلی اور ساہوکار نے دس روپیہ جیب سے نکالے اور کہا۔ ''یہ لو ٹھاکر، پھر تمھیں ہماری شرح معلوم ہے، ادھنی روپیہ ماہوار سود چلے گا، اور بھاؤ بازار پر، سیر پر آدھ سیرا وزن پر چڑھے گا اور گئو کا معاملہ ہے میں زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا، اس کو زیادہ کھلانا پلانا پن ہی پن ہے۔''

مثل مشہور ہے بھوکے کا کیا بھاؤ ہے، شرح سود اور گھی دودھ کے نرخ کو گوبردھن سنگھ نے اچھی طرح سنا بھی نہیں، ریہہ میں بیٹھے ہی بیٹھے بہی کھاتہ کھول کر ساہوکار نے اندراج کیا اور روپیہ انٹی میں لگا کر خوش خوش گوبردھن سنگھ گھر آئے۔ شیاما اپنی برکت ساتھ لائی تھی اور اس روز گوبردھن سنگھ چین کی نیند سوئے۔

(۲)

اور بھیا دیوج کا معتدل فردوسی دن آ پہنچا۔ جب آسمان برسات بھر کا دھلا دھلا شفاف نیلگوں ہوتا ہے۔ جب صبح شام خوشگوار خنکی ہوتی ہے اور دوپہر کو گلابی سلونی حرارت ہوتی ہے۔ جب خریف کی فصلیں کنوار کے سورج کی تیز کرنیں پکا چکتی ہیں اور سردی کا جمود اپنا غلبہ نہیں پاچکا ہوتا۔ دیوالی کی تاریک ترین اماوس کی رات کے بعد پہلی دیوج پر یہ پرخلوص تیوہار منایا جاتا ہے۔ اور جنکا ہمیشہ کی طرح میکے پہنچیں اور گھر میں گھستے ہی پہلی نگاہ میں تھان پر شیاما دیکھی اور دیکھ کر ایسی باغ باغ ہوئیں کہ شوہر کے دروازہ پر کبھی ہاتھی جھومتے دیکھ کر یہ خوشی نہ ہوئی تھی۔ حسب معمول

رسم ادا ہوئی - بہن نے ٹیکا کیا، گیت گایا ، پرارتھنا کی اور پکوان پکایا - بھائی کو پرسا اور خود کھایا - دان لیا اور سب وقت بار بار شیاما کا تذکرہ خوش ہو ہو کر کرتی رہیں- اور دوسری بھیا دیوج پر جنکا پہنچیں تو خوشی کے مارے پھولی نہ سمائیں- ایک فربہ دھونرا بچھڑا اور شیاما کا دودھ سے بھرا ہوا مٹکا سا "این" لٹکتا ہوا - شیاما تھی کہ نعمت کی پوٹ اور اب کی مرتبہ ہر بھیا دیوج سے زیادہ کھانے پینے کا سامان ہوا اور دان میں کچھ گوبردھن سنگھ نے بڑھانا چاہا مگر جنکا نہایت خوبصورتی سے ٹال گئی اور مقررہ رقم آگے نہ بڑھنے دی .اور جنکا بھیا کے دروازے پر ایک گائے ایک بچھڑا دیکھ کر خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گئی ، بڑی لہک کے ساتھ گیت گایا اور سسرال پہنچ کر بڑی تفصیل اور خوشی کے ساتھ شیاما اور اس کے بچھڑے اور دودھ کا تذکرہ ساس اور شوہر سے کیا - "اب تو بھیا کے تھان پر شیاما بندھی ہے - بڑی دودھار ، گھر میں دودھ گھی کی ریل پیل ہے - خوب زور کی دعوت کھائی ہوگی-"

"طبیعت اچھی ہے خوب دان پن کرتے ہیں- پھر کیوں ناہیں ملے گا -" ساس بولی - "شیاما گائے بندھی ہے -"

"اچھا شیاما ہے بھیا کے تھان پر !" شوہر نے کہا، "شیاما کے کیا کہنے کسی تقدیر والے کو ملتی ہے - دودھ، گھی ، مٹھا ہر چیز امرت کی بوند -"

"اور پھر بھاگ وان ایسی کہ گھر بھر دے" ساس نے کہا۔ اور اگلی بھیا دیوج پر جب جنکا پہنچیں تو دو بچھڑے دیکھے- "میرے بھیا کا گھر بھر جائے گا ، باڑھا بنانا پڑے گا۔" اب تو خوش ہو کر کہا - اور ساتھ ہی ساتھ جنکا نے بھائی کے

چہرہ پر اطمینان اور فراغت کی چمک دیکھی، جسم پر کپڑے بھی قدرے بہتر تھے - بڑی مطمئن آئی اور بڑے شوق کے ساتھ سسرال پہنچ کر دیر تک تذکرہ کرتی رہی - اور شیاما کو گوبردھن سنگھ کے تھان پر تیسرا سال تھا۔ کچے بیوپار کی میعاد تین سال ہوتی ہے - کنوار کے دسہرے پر ساہوکار ہر تین سال پرانا حساب بیباق کرتے ہیں اور اس دسہرے پر حساب لازمی تھا اور ساہو جی کے بہی کھاتہ میں تو دودھ کی بوند بوند گھی کا قطرہ قطرہ لکھا ہوا تھا اور ہر قیمت پر اٹھوارے کے بھاؤ ہر سیر کے اوپر آدھ سیرا چڑھی سامنے درج تھی اور ہر بھیا دیوج کے خرچ کا پیسہ پیسہ مع شرح سود ماہ بماہ درج تھا - ویسے تو حساب کتاب بالکل صاف تھا مگر ساہوجی کو تفصیل کے ساتھ سمجھانا پڑا - تین سال بھر چکے تھے - صفائی لازمی تھی - پہلی بھیا دیوج پر صرف گوبھن اوسر گائے کی کفالت تھی - دوسری پر ایک بچھڑا بھی اس رد میں آیا اور تیسری پر دوسرا بچھڑا بھی لوٹ پوٹ میں لپٹ گیا - کوڑی کوڑی جمع ہونے، بہتیرا تخمینہ بڑھایا - بچھڑوں کی قیمت بڑھا چڑھا کر لگائی مگر حساب جمع خرچ کے میزان میں دونوں بچھڑے ساہوجی کی جانب گئے اور آدھی گائے - اور آئندہ اس شرط پر گائے گوبردھن سنگھ کے حوالے کی گئی کہ بقدر ایک چہارم گھی دودھ ان کا اور بچھڑے آدھے آدھے - اور نصف گائے ملکیت میں لگوا کر اور پچھلے سے دام دام بیباق ہو کر گوبردھن سنگھ گائے لے کر پلٹ آئے اور تیسرے سال تو عام طور پر گائیں سال مرور جاتی ہیں اور ایک سال بچہ نہیں دیا کرتیں اور اس مرتبہ شیاما خالی معلوم ہو رہی تھی اور دسہرے کے بعد دیوالی اور دیوالی کے عین بعد بھیا دیوج کا تیوہار ہوتا ہے مگر گوبردھن سنگھ مطمئن تھے کہ ہر سال کی طرح اس سال

بھی وہ ساہوجی سے لے کر حسب معمول بھیا دیوج کا خرچ پورا کر دیں گے اور جب دیوالی سے پیشتر وہ ساہوجی کے پاس گئے تو ساہوجی نے صاف انکار کر دیا۔ پہلے تو آدھی گائے اور وہ بھی سوکھی۔ کاہے پر وہ اپنی رقم پھنسا دیتے۔

اور خلاف امید انکار گوبردھن سنگھ کو توپ کے گولے کی طرح لگا۔ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح وہ اُٹھا چلا آیا۔ اور بھیادیوج کے تو آج سے سات ہی دن باقی تھے۔ اگر سات دن میں سات جنم لے کر سات مرتبہ بکتا تو بھی سات روپیہ جمع نہ کر سکتا تھا۔ کچھ سوچا اور سوچ کر پھر ساہوکار کے پاس پہنچا اور کہا:

"ساہوجی تو پھر آدھی گائے آپ کی رہی اور آدھی میری۔ اس کی قیمت تخمینہ کرا کے لیئو اور آدھی جمع میری ہاتھ دھرو اور گائے تم لے لیئو۔"

"واہ ٹھاکر جی واہ! یعنی کیا ہم سوکھی گائیں پالتے پھرتے ہیں؟ تم پالو، اس کے بچے بڑھاؤ، گھی دودھ کرو۔"

"مگر میرا کام بغیر حساب آٹھ روپیہ کے نہیں بن سکتا۔ آج کے دن بھیا دیوج ہے اور جنکا آتی ہوں گی۔"

"لیکن ٹھاکر وہ کچھ ہو، بھیا دیوج یا دیوالی، سوکھی گائے اور آدھی اور آدھی روپیہ مہینہ کے سود اور بھاؤ پر سات روپیہ کیسے ہٹ جائیں۔ جتنی چادر ہوئے اتنے پاؤں پھیلائے آدمی۔"

"تو پھر مجھے اپنے حصہ کی گائے رکھنا نہیں ہے اب۔"

"نہیں پالنا ہے تو بیچ لو جہاں بکے اور آدھے دام ہمارے ہاتھ دھرو۔"

"مگر آج کل اسے لے گا کون؟ پہلے تو گابھن نہیں ہے اور گابھن بھی نکلی تو دودھ پیائے گی چھ سات مہینہ بعد۔"

"کوئی نہ لے گا تو پالو روز گار کرو۔ چار پیسہ ہمیں بھی کمائے کے دیو گے آپ بھی مٹھا بوند کھا پڑو گے۔"

"تو پھر اس بھیا دیوج کا تو خرچ پورا کر دیو۔"

"گنجائش نہیں ہے ٹھا کرو اور تمہارا بس نہ چلے تو ختم کرو بیچ ڈالو، مگر ہم تو لیں گے نہیں۔"

"تو کوئی گاؤں والا کسان تو ایسے میں لے گا نہیں، قصائی کاٹے گا" گوبردھن سنگھ نے کھسیانا ہو کر کہا۔

"کچھ ہو تم جانو، ہم کب کہتے ہیں کہ تم خالی گائے بیچو۔ تمہیں تو بیچتے ہو۔" اور گوبردھن سنگھ تاؤ میں بھرے چلے آئے۔

## (۵)

بھیا دیوج کے مقدس اور پر خلوص تیوہار میں دو دن باقی تھے اور گوبردھن سنگھ کی جیب خالی تھی۔ اس کا دل سینہ میں دھک دھک کر رہا تھا۔ اور اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اور جب اس کی بہن دو دن بعد آئے گی تو خالی ہاتھ جائے گی۔ اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے تو تعجب نہیں اور پھر اس کے پاس تو اس کے ایک وقت کے کھانے کے قابل میدہ گھی اور آلو بھی نہیں اور بھیا دیوج کی مٹھائی کی ڈلی کے لیے وہ ہرگز منہ نہ کھولے گا۔ اس کے سینہ میں کبوتر سے پھڑپھڑا اٹھے۔

عمر بھر کا تھکا ہارا اٹھ کر اپنے جھونپڑے کے سامنے صحن میں بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سر پر رکھے جیسے ہوری ایک

سلطنت کا مالک جس کا بجٹ فیل ہو رہا ہو۔ اور اس کے جد نامدار کی صدیوں کی بنی ہوئی ساکھ اور عزت مٹی میں مل رہی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور تمام ماحول کو پر تالا۔ برسات کے سڑے گلے پھونس کا جھونپڑا جس کے اندر ایک چار پائی پر کچھ چیتھڑے گدڑے پڑے، ایک جانب کچھ اوندھے سیدھے مٹی پیتل کے برتن رکھے ہوئے تھے اور اندر کو کٹھار کی کھڑکی کا دروازہ۔ بھرم بھاری پٹارا خالی۔ باہر سے ایسی چکنی چپڑی جیسے نہ معلوم اس میں کتنی جنس بھری ہے۔ اور کھو کھلے جذبات سے متاثر ہو کر اس نے ادھر سے منہ پھیر لیا، اور سامنے شیاما کھڑی دم ہلا رہی تھی۔ اور گوبردھن سنگھ سو گیا اور راجپوت جاگ اٹھا اور بجلی کی لہر سی اس کے دماغ سے چل کر رگ رگ جھنجھناتی نکلی چلی گئی اور جیسے وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے اور کڑی کمان کے تیر کی طرح مہاجن کا منہ چڑاتے جمی جولاہے کے گھر میں پہنچے۔ جمی جولاہے الاؤ کے پاس تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ جاتے ہی گوبردھن سنگھ بے دھڑک بولے ”چاچا ہماری گائے بیچ دیو۔“

”ابی بیٹا تمھاری گائے! وہ آج کل ٹھنٹھ ہے۔ کون لیے گو۔“

”جو کوئی لیو“ انھوں نے قدرے آزادی سے کہا۔

”ناہیں بیٹا کون پڑیگو، کوئی کسان تو لیے گا نہیں۔“

”پھر جو کوئی لیے۔“

اور جمی جولاہے نے غائر نگاہ سے ان کا چہرہ دیکھا اور مضبوط ارادے والے راجپوت کے انداز میں بات کر رہے تھے اور پھر بولے ”تو تم ساہوجی کو کیوں نہ لگائے دیو۔ آدھے دام تو لے لیجو۔“

" ساہوجی ناہیں لیت، کہتے ہیں پالو اور نہیں تو جہاں چاہے بیچ ڈالو - ہماری ادھیا ہمیں دے دو۔"

" ہوں تم پالو!" جمی جولاہے نے طنزیہ انداز میں کہا " بیوپار چلتا رہے - اب کے تیسرے سال دو بچھڑے اور پوری گائے انہیں ہضم ہوجائے - اور تین برس گھی دودھ نفع میں کھائیں - سالا مہاجن ہے مہاجن!" اور جمی جولاہے کو شیاما کے ساتھ لگاؤ تھا - پھر بڑے زور سے دانت کٹکٹا کر کہا " کسائی ہے (قصائی) کسائی، دیکھو تو بے ایمان گئو کٹائے دیت ہے سود کے لالچ میں۔"

" اور پرسوں بھیا دیوج ہے تم جانت ہو۔"

" میں سمجھ گیا بیٹا - پھر تم اچھی طرح سمجھ بوجھ لیئو۔"

اور مجبور ٹھاکر بچہ کی گردن ندامت، شرم اور روایات کے بار سے جھک گئی - اس کے شیر سے جسم پر روباہ کا پوستین آگیا۔

شام کو قصبہ سے جمی جولاہے بقر قصاب کو بلا لائے - بقر قصاب نے اوپر سے نیچے تک بالوں میں ہاتھ گڑا گڑا کر شیاما کو پڑتالا، چرسہ بغور دیکھا - اوپر سے بغور معائنہ کیا، نیچے جھک جھک کر دیکھا پھر آہستہ سے دم کھینچی اور بڑبڑایا، دو من مال ہے رباج (چربی) سمیت - بس دو من!

اور ٹھاکر کے کان میں جس کے تین سال کے گھی دودھ کی آواز کا وزن ساہوجی کے بہی کھاتہ سے حساب ہوکر گیا تھا آج اسی کے گوشت کا تخمینہ کیا جا رہا تھا - جمی جولاہے نے سودا چکایا اور چودہ روپیہ میزان لگی - شیاما کی رسی بقر قصاب نے پکڑی اور چودہ روپے گوبردھن سنگھ کو پکڑائے - گوبردھن سنگھ نے روپے ہاتھ میں لیے، جیسے بچھو نے کاٹ لیا - بغیر گنے جمی

جولاہے کی جانب بڑھائے اور رکتی ہوئی آواز میں بولے "چاچا تم سات روپیہ اس مہاجن کو دے آؤ اور سات اپنے پاس دھر لیو۔ کل دوپہر جنکا آئیں تو پہنچا دیجیو۔"

"تو پھر تمھیں دھر لیؤ نا۔" جمی نے کہا۔ اور گوبردھن سنگھ کو ایسا سنائی پڑا جیسے کہہ رہے ہیں "ایک من گوشت تم نے بیچا ہے اس کے سات روپیہ بھی تم اپنے پاس رکھو۔"

"ناہیں چاچا تمھیں دھر لیو اپنے پاس اور سات آپے دے آؤ مہاجن کو" گوبردھن سنگھ نے چلتے ہوئے کہا اور جیسے ایک من گوشت کا ٹوکرا سر پر دھرے گھر کی جانب پلٹے۔ انھیں خوب یاد تھا کہ بچپن میں کہانیوں میں سنا تھا کہ محمد غوری نے جب دوسری مرتبہ دلی پر حملہ کیا تو اپنی فوج کے آگے گایوں کا بہت بڑا گلہ کر دیا تھا اور بڑھتے چلے آئے تھے اور اُن کے آگے ہونے کے سبب چوہان اپنی تلواریں بند کیے پیچھے ہٹتے رہے اور محمد غوری کی فوج بڑھتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ انھوں نے گئوؤں کی ڈھال کی آڑ میں دلی فتح کر لی تھی اور چوہان گئوؤں کو کاٹ کر ترکوں تک نہ پہنچ سکتے تھے اور بغیر لڑے دلی فتح ہو گئی تھی۔

اور اس کی تلوار گائے کی حفاظت کے لیے بنی ہے اور آج اپنے ہاتھوں وہ گائے کو چھری تلے دے کر آ رہا ہے۔ وہ اپنے سنسان گھر میں پہنچا۔ شیاما کے تھان پر گوبر بدستور بکھرا ہوا تھا اور سانی کی ناند میں چارے کے پس خوردہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور اس نے ایک گہری سانس لی اور زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا . . .

اور بھیا دیوج کے دن حسب معمول جنکا اسٹیشن پر اتری

اور کارندہ ہر سال والا مقررہ سامان خریدنے شہر چلا گیا ۔ گاڑی شام کو جایا کرتی تھی اور جنکا ہمیشہ اسٹیشن پر کارندہ کو منتظر ملتی تھی ، مگر آج واپس نہ پہنچی تو جڑ مہری ، کہار وہاں موجود تھے اُن کے حوالے کپڑے اور مٹھائی کا ٹوکرا کیا اور کہہ دیا کہ گھر کہہ دینا کہ بھوجی اور منشی جی کو بھیا نے ٹھہرا لیا ہے اور وہ کل آئیں گے۔

صبح ہی جنکا بھائی کے دروازے کے قریب پہنچی تو کچھ مجمع اور کچھ آوازیں سن کر ماتھا ٹھنکا۔ جب آگے بڑھی تو جتنے منہ اتنی باتیں۔ "اچھے خاصے تھے کل دن مُندے۔"

"ارے ہمارے پاس بیٹھے چلم پیت رہے۔"

"اور کل دن مندے سات روپیہ بھیا دیوج کے میرے پاس دھرو (امانت) دھرے۔"

اور اتنے میں شور ہوا کہ "آئے گئیں ، آئے گئیں ، جنکا آئے گئیں۔" اور جنکا چیرتی پھاڑتی اندر پہونچی تو گوبردھن سنگھ کے جنازہ پر جا کھڑی ہوئی ۔ فطری طور پر بہن کی چیخ نکل گئی ۔ تمام جسم پیٹ کر پھینک دیا۔ سبب موت پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور افیون کی کاشت تو تمام گاؤں میں عام تھی اور سال دو سال پیچھے ایک دو قصے ایسے ہو ہی جاتے تھے مگر سبب کا پتا نہ تھا ۔ جب جنکا رونے پیٹنے سے ذرا ہوش میں آئی اور وہ مخصوص گیت بین کے لہجہ میں گایا جو بھیا دیوج پر گایا کرتی تھی - اور جمی جولاہے نے گوبردھن سنگھ کی امانت انٹی سے نکال کر دے دی اور جنکا نے گوبردھن سنگھ کے جنازہ پر کھڑے ہو کر ٹیکا کیا اور پھر مٹھائی کی ڈلی بند ہونٹوں کی جانب بڑھا کر بین کیے ، مگر گوبردھن سنگھ تو آج کی بھیا دیوج کے

دان کا راز اپنے بند ہونٹوں میں چھپائے اس قدر خاموش تھے کہ ہونٹ بھی نہ کھلے۔

اور جب لاوارثی جنازہ ٹکٹی بنا کر اور کفن پہنا کر جنکا نے گاؤں کے پنچوں کے حوالے کیا تو دروازہ پر شیاما کو لیے قصائی کھڑا تھا جو آہستہ آہستہ جمی جولاہے سے کہہ رہا تھا کہ "ڈاکٹر نے پاس نہیں کی۔ گائے گابھن نکلی۔ سالے کو دو روپیہ دیتا رہا، نہیں مانا۔ آج کی دکان داری بھی ماری گئی۔ اور جنکا شیاما کو پہچان کر قریب آگئی اور سب حال معلوم کر کے بھیا دیوج کے دان والے سات روپے اور ساہوکار والے سات روپے علیحدہ علیحدہ نکال کر حوالے کیے اور کارندہ سے آہستہ سے ایک جانب لے جا کر کہا۔

"منشی جی اب کی مرتبہ بھیا دیوج کے دان میں بھیا نے شیاما گائے دان کی ہے۔ سمجھ گئے۔"

# ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب میٹرک سے لے کر تمام امتحانات اعزاز کے ساتھ پاس کرتے رہے۔ ایم۔اے کے بعد ہی سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں تاریخ کے استاد ہو گئے۔ پھر انگلستان سے تاریخ میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جب دہلی یونی ورسٹی قائم ہوئی تو وہاں تاریخ کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بہ حیثیت طالب علم اور پروفیسر دونوں ہی حیثیتوں سے بہت ممدوح رہے۔ ان کی متانت اور سنجیدگی ان کے ڈراموں سے ظاہر ہے۔ وہ ہنگاموں سے الگ تھلگ علمی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ بعد ازاں پاکستان کے وزیر تعلیم ہوئے۔ اس سے سبکدوشی کے بعد امریکہ کی مشہور کولمبیا یونی ورسٹی میں کئی سال تک تاریخ اور پاکستانی ثقافت کے پروفیسر رہے۔ اس کے بعد اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان کے ڈائرکٹر ہوکر کراچی آگئے۔ ڈاکٹر صاحب کی طرز تحریر شگفتہ اور سلیس

ہے - وہ بلا ضرورت طول کلام کے قائل نہیں ہیں ۔
وہ اپنے مقصد کو صاف اور واضح طریقے سے بیان کرنے
کی قدرت رکھتے ہیں - ایک عرصے تک کراچی
یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں -

# نقش آخر

(وقت : ۸ بجے شب)

دیوان خانے کا دالان ہے اور حقہ بھرا ہوا رکھا ہے ، گلوریاں بنی ہوئی رکھی ہیں ، البتہ پنکھا نہیں ہے ، اس لیے کہ جاڑے کا موسم ہے - جب پردہ اٹھتا ہے تو محسن ، عباس اور مہدی بیٹھے نظر آتے ہیں -

مہدی : ہائے ، ہائے ! وہ صحبتیں اب کہاں ؟ ایسا وقت بھی کبھی کسی شہر پر نہ گزرا ہوگا ، پہلے لکھنؤ ویران ہوا ، اب دلی تباہ ہوئی -

عباس : آپ نے سنا ہوگا کہ اُستاد کا بیشتر کلام ضایع ہوگیا -

محسن : کیا کیا جواہر ریزے تھے ، اب طبیعت میں وہ امنگ کہاں ؟ وہ شاہی دربار کی ہمت افزائیاں کہاں میسر ہو سکتی ہیں کہ وہ پھر آب دار شعر کہہ سکیں -

مہدی : بھائی بات تو یہ ہے کہ اہل کمال اول تو اکثر موت کے گھاٹ اترے - دو چار جو بچ بچا بھی گئے ان کی کوئی قدر نہیں کرتا -

عباس : قدر کون کرے ، کس میں مقدور ہے ؟ سب روٹیوں کے محتاج ہوگئے - یہ چیزیں حاکم وقت کی فیاضی سے چلتی ہیں - وہ غیر ملک کے لوگ ، غیر مذہب ،

غیر زبان ، انہیں کیا پڑی ہے کہ ان چیزوں سے دلچسپی لیں۔

مہدی : وہ تو اپنے علم و ہنر کے سامنے کسی کو گردانتے ہی نہیں ، ہماری اچھی سے اچھی چیز کو ناکارہ سمجھتے ہیں -

محسن : ہاں حکومت کا نشہ چیز ہی ایسی ہے - جو قوم حاکم ہوتی ہے ، وہ اپنی ہر چیز کو افضل سمجھتی ہے - اگر انگریز ایسا کرتے ہیں تو کیا تعجب ہے ؟

مہدی : جب کسی قوم کو اس کی بد اعمالیوں کی سزا ملتی ہے تو خدا اسے دوسری قوم کا محکوم بنا دیتا ہے - محکوم ہونا بھی قہر الٰہی ہے -

عباس : ہائے ہائے ! گردش روزگار بھی کیا چیز ہے - ایک زمانہ تھا جب ہم بھی سریر آرائے سلطنت تھے ، ہماری فوجوں کو شکست کا نام تک نہ آتا تھا - ہر طرف دھاک بیٹھی ہوئی تھی ، ایک یہ دن ہے کہ پیٹ بھر کر روٹی کھانے کو نہیں ملتی . . . کیا ہوا ، کسی نے روکھی سوکھی کھا کر اپنا پیٹ بھر لیا - یوں تو جانور بھی زندہ رہتے ہیں -

مہدی : یہ زندگی جانوروں کی زندگی سے بدتر ہے ، انہیں اپنی بے چارگی کا احساس نہیں ہوتا ، ان کے لیے ماضی حال مستقبل سب یکساں ہے - انہیں گزشتہ جاہ و جلال کی یاد تو نہیں ستاتی ، انہیں اپنا حال دیکھ کر رونا تو نہیں آتا - انہیں اپنے مستقبل کی تاریکی سوہان روح تو نہیں ہوتی -

محسن : دیکھو کیا حالت ہو گئی ! شہر میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص رہ گیا ہے جس سے واقفیت نکلے ....... دہلی علم و فن ، تہذیب و تمدن کا مرکز تھا ، یا آج یہ حالت ہو گئی !

عباس : اور یہ زمانہ اگرچہ بہت برا ہے لیکن پھر بھی غنیمت ہے ۔ جو اہل کمال مرتا ہے اس کی جگہ خالی ہو جاتی ہے ۔ دوسرا ویسا پیدا نہیں ہوتا... اور نہ اس زمانہ میں پیدا ہو سکتا ہے ۔

محسن : ہاں درست ہے ، کیوں کر پیدا ہوسکتا ہے ، کمال بڑی محنت و مشقت کے بعد پیدا ہوتا ہے ۔ بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے ، جب اہل کمال کو سب دیکھتے ہیں کہ ننگے بھوکے پھرتے ہیں اور زمانہ ان کا دشمن ہے تو طبیعت اس طرف کیا خاک راغب ہو ۔

عباس : ہاں نہیں ہوسکتی ! سنا ہے کہ بعض رجواڑوں میں اب تک کچھ قدر باقی ہے اور بچے کھچے لوگ اسی طرف کھنچ رہے ہیں ۔

محسن : لیکن کتنے ؟ اور رجواڑوں اور ریاستوں میں یہ بات پیدا ہی نہیں ہوسکتی ، ان کے ذرایع محدود ۔ پھر رئیس ایسے صاحب ذوق کہاں ہیں کہ کھرے کھوٹے کو پرکھ سکیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ شاہان تیموریہ اور خاندان اودھ کے اوصاف کسی رئیس میں پیدا ہونے آسان نہیں ہیں ۔

(دستک کی آواز آتی ہے)

کون صاحب ہیں؟ (اٹھ کر خود باہر جاتا ہے ، تھوڑی دیر

میں واپس آتا ہے ۔ آگے آگے مرزا طاہر ہیں جو ان لوگوں کے ہم عمر ہی معلوم ہوتے ہیں ۔)

مرزا طاہر : آداب عرض

عباس : آداب عرض

مہدی : آدب عرض

مرزا طاہر : الحمدللہ ! آپ کا مزاج بخیر ؟

عباس : جی ہاں ، اللہ کا شکر ہے ۔

مہدی : الحمدللہ ! تشریف رکھیے ۔

مرزا طاہر : جناب تشریف رکھیں ۔

(تھوڑی سی دیر کے تکلف کے بعد سب بیٹھ جاتے ہیں ۔)

(محسن سے مخاطب ہو کر) ملاقات کو ایک عرصہ گزر گیا ۔ دہلی آیا تو تمھارے متعلق لوگوں سے حال دریافت کیا ۔ اس قدر افسوس ہوا کہ بیان سے باہر ہے ... سخت مصائب کا سامنا ہوا ۔

محسن : اللہ کو جو کچھ منظور تھا ہوا ، اس میں کسی کو کیا دخل ہے ؟

مرزا طاہر : خدا کے کارخانے سمجھ میں نہیں آتے ، شہر کو دیکھتا ہوں تو پہچاننے میں نہیں آتا ۔ اللہ اکبر کیا انقلاب ہوا ، کیا ہو گیا ۔ ایک گھرانا ایسا نہیں جس میں صف ماتم نہ بچھی ہو ۔

عباس : حضرات ! ہر طرح تباہ ہوئے ، آدمی قتل ہوئے ، گھر لٹے ، جائدادیں ضبط ہوئیں ........ معاش کا کوئی ذریعہ نہیں رہا ۔

مہدی : ایسے ایسے لوگ جن کے دسترخوان کی وسعت

ضرب المثل تھی وہ نان شبینہ کو محتاج ہوگئے -

محسن : اور پھر مشکل یہ کہ آئندہ کوئی راہ کھلتی ہوئی نظر نہیں آتی ....... شرفاء کی حالت ناگفتہ بہ ہے ، کیا کریں ؟ محنت مزدوری ممکن نہیں ، گداگری کر نہیں سکتے ........ کوئی سبیل نظر نہیں آتی - حاکم وقت کی نظر میں مقہور ....... خدا جانے اسے کیا منظور ہے ؟

مہدی : عزت و آبرو بچانی محال ہے ...... بے معاش کے شرافت نبھانی دشوار ہے - کچھ لوگ رجواڑوں میں چلے گئے ، کچھ جا رہے ہیں - لیکن وہاں بھی کھپت کیوں کر ممکن ہے ! جو ریاستیں معتوب تھیں وہ ضبط ہوگئیں ، جو انگریز کی طرفدار ہیں ، وہ دلی والوں کو اپنے یہاں رکھتے ڈرتے ہیں - غرض ع :

زمیں تنگ اور آسماں دور ہے

طاہر : جی ہاں ، بجا ارشاد ہوا ........ ایسی نکبت کا زمانہ کبھی نہیں دیکھا - سمجھ میں نہیں آتا ہے کیا حشر ہوگا ....... خصوصاً جب ہماری قوم میں اس قدر قدامت پسندی ہے کہ ہر نئی چیز کو برا سمجھتے ہیں ، زمانہ کی حالت بدل گئی - اگر زمانے کے ساتھ ہم نہ بدلے تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے - اس طرح ماتم کرنے سے کچھ حاصل نہیں - کوئی تدبیر کرنی چاہیے -

مہدی : تدبیر کیا ہوسکتی ہے ؟ اس بے چارگی کی حالت میں کیا کر سکتے ہیں ؟ اب ہم لوگوں میں کہاں

سکت ہے کہ ہم کچھ کر سکیں۔

طاہر : آپ نے سید احمد کا نام سنا ہے ؟ آپ ہی کے شہر کے رہنے والے ہیں۔

عباس : جی ہاں انگریزی ملازم ہیں، سنا ہے بڑا رسوخ رکھتے ہیں، اس لیے کہ غدر کے زمانے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔

مہدی : جی ہاں ! ساتھ بھی کیا دیا تھا، اب تک دے رہے ہیں۔ سنا ہے وہ اسلام سے منحرف ہو گئے اور کرسٹان بن گئے۔ اس وجہ سے ان کی اس قدر چلتی ہے ..... نعوذباللہ ! ایسا رسوخ کس کام کا کہ آدمی دنیا کے لیے اپنی عاقبت بگاڑ لے۔

طاہر : نعوذباللہ ! آپ کیا فرما رہے ہیں، سید احمد اور کرسٹان ہو جائیں ؟ وہ تو بہت اسلام دوست آدمی ہیں۔ ان کے دل میں اسلام کا اس قدر درد ہے کہ مشکل سے کسی کے دل میں ہوگا۔

مہدی : قبلہ کیا فرماتے ہیں ؟ اگر اسی کا نام اسلام دوستی ہے تو آپ سے دور ہی سے سلام ہے۔

طاہر : کیوں، انھوں نے ایسی کیا حرکت کی کہ آپ اس قدر بدگمان ہیں۔

مہدی : حرکت ! وہ مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ایسی تعلیم کے طرفدار ہیں جو سراسر بے دینی پر قائم ہے۔

طاہر : یہ آپ کی خام خیالی ہے۔

مہدی : وہ انگریزی تعلیم کے حامی نہیں ہیں ؟

طاہر : جی ہاں ہیں اور بہت شدت سے ، لیکن اس میں بے دینی کی کیا بات ہے ؟ کسی زبان کے سیکھنے پر دین اور کفر کا دار و مدار نہیں ہے -

عباس : جی ہاں ، یہ تو بجا ارشاد ہوا لیکن وہ تعلیم جو مذہب سے بالکل بے علاقہ ہو ، بے دینی کی جڑ ہے - جن کتابوں میں خدا کے نام کی جگہ کتے ، بلی اور چوہے کا ذکر ہو اس سے بچوں میں مذہبی احساس کیوں کر پیدا ہوگا ؟

طاہر : اس کا تو یہ علاج ممکن ہے کہ بچوں کو ساتھ ساتھ دینیات کی بھی تعلیم دی جائے ، یہ کیا دشوار ہے ؟

مہدی : ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں -
( خدا کو بھی چاہتے ہو اور اس کمینی دنیا کو بھی )
ایں خیال است و محال است و جنوں -
( یہ محض خیال ہی خیال ہے اور ناممکن بلکہ جنون ہے )
یہ پیوند بہت انمل بے جوڑ رہے گا -

طاہر : آخر کیوں ؟

عباس : اس لیے کہ تعلیم محض کتابیں پڑھا دینے اور زبان سکھا دینے کا نام نہیں ہے ، بلکہ دماغ پر اثر ڈالنے کو کہتے ہیں ، اس لیے ضرورت ہے ماحول کی ، جب بچے اپنے اساتذہ میں تقدس اور مذہب نہیں دیکھیں گے تو وہ خود بھی قبول نہیں کریں گے اور جو ان کے استادوں کی روش ہوگی وہی آہستہ آہستہ ان کی ہو جائے گی -

طاہر : یہ آپ کا خیال ہے ، اس لیے کہ جب عربوں نے علوم و فنون کا ذخیرہ جمع کیا تو کیا انھوں نے اسلام چھوڑ دیا ؟

مہدی : نہیں ، لیکن وہ حاکم تھے ، حاکم کا لوگوں پر بہت اثر پڑتا ہے ، اب تو ہمارے استاد ہی ہمارے حاکم بھی ہوں گے ، پھر ہمارے شعار و طریقہ کا خدا حافظ ہے ۔

طاہر : حضرت ! کیا رسول اللہ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ علم مومن کی میراث ہے ، اسے جہاں بھی ملے حاصل کرے ۔ انگریزوں کی قوت و ترقی کا سبب علوم و فنون میں ہے ، اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی ان علوم کو سیکھنا چاہیے جو ان کی ترقی کا سبب ہیں ۔

عباس : سنا ہے کہ سید احمد خاں کے عقائد میں بھی فرق ہے ۔ وہ نیچری ہے ۔

طاہر : آپ ان کے عقائد کا نام کچھ بھی رکھ دیں ، لیکن ان کے عقائد اسلام کے خلاف نہیں ہیں ، ان کا وہی مشرب ہے جو متکلمین کا رہا ہے ۔

مہدی : آپ ان کے بہت معتقد معلوم ہوتے ہیں ۔

طاہر : جی ہاں .... سنیے ابھی یہ ذکر ہو رہا تھا کہ ہمیں ترقی کرنا تو درکنار زندہ رہنے کی بھی کوئی سبیل نظر نہیں آتی ... کیا ایسی حالت میں دین کو قائم رکھنا ممکن ہوگا ؟ کیا ساری قوم کے بھوکے مرنے سے اسلام کی حفاظت ہو سکتی ہے ؟ کیا افلاس اور تنگ دستی مذہبی زندگی کے معین و مددگار ہیں ؟

مہدی : دنیوی جاہ و جلال اور دولت و فراخ دستی ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ہم اپنے شعار، اپنی روایات، اپنے آئین اور اپنے مذہب کو اس پر قربان کر دیں .... آخر غیرت و حمیت بھی کوئی چیز ہے .... ہمیں دنیاوی امور میں شکست ہوگئی ہے تو کیا ہم دماغی اور دینوی امور میں بھی شکست مان کر اپنی ہستی کو ختم کرلیں ؟ کیا ہماری تہذیب اور ہمارے مذہب ، ہمارے علوم ، ہمارے فنون سب اس قابل ہیں کہ ہم ان کو چھوڑ دیں اور اغیار کا طریقہ اختیار کرلیں ؟ اگر ہمیں ان چیزوں کو چھوڑ کر روٹی مل سکتی ہے تو تف ہے اس روٹی پر ، بھوکا مرنا اس سے بدرجہا بہتر ہے ۔

طاہر : میرا مفہوم یہ نہیں تھا کہ ہم اپنے طریقے کو چھوڑیں ..... نہ سید احمد یہ چاہتے ہیں .... میرا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی حالت دنیوی طریقہ سے درست کریں ، تا کہ دین کی حفاظت کرسکیں ۔

(شبیر ایک خاصدان میں پانوں کی گلوریاں لے کر داخل ہوتا ہے ، سب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ۔ وہ سب کو آداب عرض کرتا ہے )

طاہر : (ذرا کھینچ کر جس طرح بچوں کے سلام کا جواب دیتے ہیں) آداب عرض !

(شبیر خاصدان کو جا کر قرینہ سے رکھ دیتا ہے اور واپس جانے لگتا ہے )

طاہر : صاحبزادے یہاں آؤ ۔

(شبیر ان کے پاس جاتا ہے ........ طاہر اسے گود
میں بٹھا لیتے ہیں -)

طاہر : (محسن کی طرف متوجہ ہو کر) آپ کی تعریف ؟

محسن : میرا چھوٹا بھائی ہے ، بس ایک یہ اور ماما ہی خاندان بھر میں بچے ہیں -

طاہر : آپ نے ان کی تعلیم کا کیا انتظام کیا ؟

محسن : کیا انتظام کروں ؟ ارادہ ہے کہ محلہ کی مسجد میں پھر بھیجنا شروع کردوں -

طاہر : اس کے بعد ؟

محسن : وہی رسمی تعلیم .......... مصوری تو خاندان سے گئی - میں نے سیکھی نہیں اور انہیں سکھانی فضول ہے - اس لیے کہ اب کون قدر دان ہے ؟ اور سکھانے والا بھی میسر نہیں -

طاہر : ہاں اس زمانے میں سکھانے والا کہاں سے آیا ؟ آپ کے والد ماجد کی بہت شہرت تھی -

مہدی : حضرت صاحب کمال تھا ، اب ایسے کاہے کو پیدا ہوں گے ...... وہ تصویر بناتے تھے کہ جان ڈالنے کی دیر رہ جاتی تھی .......... صاحب عالم بہادر کی تصویر کی تو شہر بھر میں شہرت تھی - غالباً وہی ان کی آخری تصویر تھی ، خدا جانے اب کہاں ہوگی ! تباہی سے بچی یا نہیں ؟

محسن : جی نہیں ، آخری تصویر انہوں نے اور بنائی تھی ، وہ حضرت ظل سبحانی کی شبیہ مبارک تھی .... افسوس

کہ اس کے پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئی ۔

مہدی : وہ تصویر بچ سکی ؟

محسن : جی ہاں ! وہ انھوں نے دہلی سے روانہ ہوتے وقت مجھے دی تھی اور حفاظت کی انتہائی تاکید فرما دی تھی ..... میں نے تمام مصائب میں اسے حرز جان بنایا اور خدا کے فضل سے وہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے ۔

طاہر : اگر کہیں اوپر ہو تو ہمیں بھی زیارت کرادیجیے ۔

مہدی : اگر تکلیف نہ ہو ۔

محسن : جی نہیں ! اس میں تکلیف کی کیا بات ہے ؟
(جاتا ہے)

طاہر : (شبیر سے) آپ کا کیا نام ہے !

شبیر : اس خاکسار کو شبیر کہتے ہیں ۔

مہدی : میاں شبیر ۔

شبیر : ارشاد ۔

مہدی : آپ کی ٹوپی بہت اچھی ہے ۔
(شبیر مسکرا کر خاموش رہتا ہے)
میری ٹوپی سے بدل لیجیے ..... کہیے منظور ہے؟

شبیر : میری ٹوپی ویسے ہی حاضر ہے ۔ لیکن آپ کے چھوٹی ہوگی ۔ (سب ہنس دیتے ہیں)

طاہر : ماشاءاللہ ! کیا معقول جواب دیا ہے !

عباس : بچہ ذہین ہے !

طاہر : اس کی تعلیم کا اچھا انتظام ہونا چاہیے ، ایسے ذہین بچے کی تعلیم کا اگر اچھا انتظام نہ ہوا تو یہ ذہانت بے کار جائے گی ۔

مہدی : تعلیم سے آپ کی مراد اسی انگریزی تعلیم سے ہوگی ۔

طاہر : جی ہاں ، اور کون سی تعلیم ممکن ہے ؟

مہدی : آپ پر سید احمد نے بڑا جادو کیا ہے ...... ان کے خیالات کی تائید و اشاعت کا ہر وقت خیال رہتا ہے ۔

طاہر : جی ہاں اس لیے کہ مجھے اس کے علاوہ کوئی مفر نظر نہیں آتا ۔

مہدی : میں تو آپ کے مفر کو بھی مفر نہیں سمجھتا ۔
(محسن داخل ہوتا ہے ۔ ہاتھ میں تصویر ہے )
لیجیے ، محسن صاحب تصویر لے آئے ۔
( طاہر ، مہدی اور عباس دیکھتے ہیں )

طاہر : واللہ ، کیسی اچھی تصویر ہے ....... عیناً حضرت ظل سبحانی ...... خد و خال ، رنگ ، نوک پلک ، پوشش ، کسی چیز میں سر مو فرق نہیں ۔ واقعی معلوم ہوتا ہے بولے اٹھتے ہیں ۔ چہرے سے وہی بزرگی ٹپکتی ہے جو حضرت کا خاصہ تھی ۔

عباس : ہائے ہائے کسے معلوم تھا کہ زمانہ ایسی بزرگ ہستی کو یوں ستائے گا ؟

مہدی: بے گناہ ، بے قصور ، افسوس ! اب وہ دور کیا واپس آئے گا ۔

طاہر : بھائی محسن ! اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک بات کہوں ؟

محسن : تمھاری بات ناگوار ہو سکتی ہے !

طاہر : محض ہمدردی کی وجہ سے کہہ رہا ہوں ۔

محسن : یا اللہ اس قدر تکلف کیوں ہے ؟ کہو بھائی !

طاہر : میں یہ کہتا ہوں کہ زمانہ نازک ہے ...... ایسے زمانے میں تم کو روپیہ کی ضرورت ہوگی .... دربار جیسے پور میں اب بھی ان چیزوں کی کچھ قدر باقی ہے .... اگر تم اس تصویر کو مہاراجا صاحب کی خدمت میں پیش کرو تو ممکن ہے کہ ایسا انعام و اکرام مل جائے جو آگے کچھ عرصہ تک عسرت کا علاج ثابت ہوسکے اور شاید دربار میں کوئی اور صورت بھی پیدا ہو جائے ۔

محسن : بھائی یہ درست ہے ، لیکن یہ میرے والد کی نشانی ہے ۔ انھوں نے امانت کے طور پر مجھے مرحمت فرمائی تھی ، میں جدا نہیں کر سکتا ۔ مجھے بھوکا مرنا منظور ہے لیکن اسے جدا کرنا منظور نہیں ۔

شبیر : نہیں بھائی جان یہ تصویر آپ کسی کو نہ دیجیے گا ۔

محسن : نہیں بھائی .... میں بھلا دے سکتا ہوں ؟

طاہر : اچھا تم نے شبیر کی تعلیم کے متعلق کیا سوچا ہے ؟

محسن : کیا کہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا !

طاہر : میری رائے یہ ہے کہ اسے انگریزی پڑھاؤ ۔

محسن : فائدہ ؟

طاہر : ورنہ یہ کیا کریں گے ؟ پرانی تعلیم دینے سے کیا حاصل ؟

محسن : لیکن ان کے مذہبی عقائد کیوں کر درست رہیں گے ؟

طاہر : سید احمد ایک مدرسہ قائم کر رہے ہیں جس میں دینیات کی تعلیم بھی دی جائے گی ، مشرقی علوم بھی پڑھائے جائیں گے اور انگریزی بھی پڑھائی جائے گی ۔ اکثر اساتذہ مسلمان ہوں گے ، اس لیے کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہے ۔

مہدی : مجھے تو یہ طریقہ خطرے سے خالی نہیں نظر آتا ۔

طاہر : یہ بھی تو سوچیے کہ اگر انھیں اس قسم کی تعلیم دی گئی تو کیا کریں گے ۔ آج بڑی سعی و سفارش سے کسی ریاست میں بھی پرانے تعلیم یافتہ لوگوں کو جگہ مل جاتی ہے ، کل وہاں بھی نہ ملے گی ۔

محسن : ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ یہ نئے تعلیم یافتہ مذہب اور تہذیب کو کھو بیٹھیں گے ۔

طاہر : یہ محض خیال ہے ، جب ان بچوں کو اسلامی ماحول میں تعلیم دی جائے گی تو پھر کوئی سبب نہیں کہ یہ بے دین ہو جائیں ۔

محسن : ہاں یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ محض زبان کی تبدیلی یا جدید علوم کو سیکھنا مذہب کے خلاف نہیں ہوسکتا ۔ سب میں بڑی چیز وہ ماحول ہے جو بچوں کے لیے مہیا کیا جائے گا ۔ اگر وہ مناسب ہوا تو پھر اندیشہ نہیں ۔

طاہر : اس کا میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا انتظام ضرور کیا جائے گا ۔

مہدی : یہ کیوں کر ممکن ہے ؟ مسلمان اساتذہ کہاں سے ملیں گے ؟

طاہر : یہ ضرور ہے کہ شروع میں سب اُستاد مسلمان نہیں ہوں گے لیکن اُردو ، فارسی ، عربی اور دینیات پڑھانے والے مسلمان ضرور ہوں گے ۔ اور آہستہ آہستہ اور اُستاد بھی پیدا ہو جائیں گے ۔ آپ خود ہی غور فرمائیے کہ اسلامی سلطنت میں اتنے ہندو فارسی اور عربی پڑھتے تھے ، وہ ہندو ہی رہے یا مسلمان ہو گئے ۔

مہدی : بہت سے مسلمان ہو گئے ۔ اس کے علاوہ اس تعلیم میں اور ہماری تعلیم میں فرق تھا ۔ ہمارے یہاں تمام تعلیم کا مرکز خدا تھا ۔ ہر چیز میں اس کا نام آتا تھا اور ہر وقت بچوں کے ذہن نشین رہتا تھا ۔ اس تعلیم میں تصوف کو اتنا بڑا رتبہ حاصل تھا اور تصوف کی بنیاد رواداری پر ہے . . . میں تو اس تعلیم کا مخالف ہوں ۔

عباس : خیر یہ ایسی چیز نہیں ہے جو ایک دن کی بحث سے طے ہو جائے ۔ اس میں بڑی گفتگو کی گنجائش ہے ۔

طاہر : آپ کا یہ خیال درست ہے ۔ بھائی محسن ! میں اس بحث پر تم سے پھر گفتگو کروں گا ۔

محسن : بہت مناسب ہے ۔

طاہر : اور اگر ممکن ہوا تو سید احمد سے بھی تمھیں ملادوں گا ۔

محسن : بڑی عنایت ہوگی ۔

طاہر : اس میں عنایت کی کیا بات ہے ۔

مہدی : اچھا اب زیادہ دیر ہوگئی ۔ میں اجازت چاہتا ہوں ۔

عباس : میں بھی ۔

محسن : ایسی دیر تو نہیں ہو گئی ہے ، آپ کا کیا خیال ہے ؟

مہدی : بس اس وقت تو اجازت ہی دیجیے ۔

محسن : تشریف لے جایے گا !

مہدی : آداب عرض ۔

عباس : آداب عرض ۔

محسن اور طاہر : آداب عرض ۔

شبیر : آداب عرض۔

مہدی اور عباس : آداب عرض ( مصافحہ کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔ )

شبیر : بھائی جان ! میں بھی اجازت چاہتا ہوں ۔

محسن : جاؤ میاں ، تمھیں دیر ہوگئی ہے ، سو رہو۔

طاہر : بھائی محسن بسر اوقات کا کیا ذریعہ ہے ؟
( محسن خاموش رہتا ہے ۔) — بتاؤ خاموش کیوں ہو ؟ مجھ سے کیا پردہ !

محسن : بھائی جب میں واپس آیا تھا تو رامپور سے چلتے وقت زادراہ کے طور پر ایک مہربان نے کچھ دے دیا تھا ۔ یہاں آکر دیکھا تو سب لٹ چکا تھا ۔ البتہ تہہ خانے میں ایک چھپر کھٹ کے پائے رہ گئے تھے ، ان پر چاندی کے پترے چڑھے تھے ، کچھ دن انھیں بیچ کر گزارہ کیا .... اب مکان پر ایک بنیے سے قرض لے رہا ہوں .... مجھے تو شبیر کا خیال ہے ...... میری زندگی کا بڑا حصہ گزر گیا ، جو بچا ہے وہ بھی گزر جائے گا ۔

طاہر : (اپنی جیب سے کچھ نکال کر) بھائی یہ قبول کرلو

مجھ میں اور تم میں کبھی تکلف نہیں رہا .... انکار نہ کرو۔

محسن : نہیں طاہر یہ نہیں ہو سکتا .... ابھی میرے پاس یہ مکان موجود ہے، جب کچھ نہ رہے گا تو محنت مزدوری سے پیٹ بھروں گا۔

طاہر : تم غیریت برتتے ہو!

محسن : نہیں یہ بات نہیں ہے ... تم خود سوچو!

طاہر : میں سمجھتا ہوں .... (روپیہ جیب میں رکھ کر) میں کوشش کر کے کہیں روزگار نکالوں تو کرلو گے؟

محسن : ہاں ضرور ... نیکی اور پوچھ پوچھ!

طاہر : دلی کے باہر؟

محسن : ہاں ضرور .... دلی میں بھوکے مرنے سے تو بہتر ہے۔

طاہر : اچھی بات ہے میں کوشش کروں گا .... اور انشاءاللہ کامیابی ہوگی! ایک کہنا تو مان لو!

محسن : کیا؟

طاہر : بنیے کا قرض ادا کردو، ورنہ محل سرائے ہاتھ سے نکل جائے گی۔

محسن : یہ کیوں کر ممکن ہے؟

طاہر : میرے پاس کچھ روپیہ ہے وہ قرض لے لو، میرے پاس روپیہ یوں ہی پڑا ہے۔ تمھیں سود نہیں دینا پڑے گا۔

محسن : لیکن ...

طاہر : یہ کوئی بات نہیں ہے، تمھیں روزگار مل جائے تو ادا کردینا .... اگر زیادہ عرصہ گزر جائے ... اور تم

ادا کرنا چاہتے ہو تو مکان بیچ کر ادا کر دینا . . .
(محسن بڑی احسان مندی کے ساتھ طاہر کی طرف دیکھتا ہے)

طاہر : اچھا بھائی اس وقت رخصت ہوتا ہوں ، کل ملوں گا ۔
(بغل گیر ہوتا ہے ۔)

(پردہ)

# محمد مجیب

پروفیسر محمد مجیب صاحب لکھنؤ کے مشہور ایڈوکیٹ محمد نسیم صاحب مرحوم کے صاحبزادے اور پروفیسر محمد حبیب کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ اس کے بعد آکسفورڈ یونی ورسٹی سے تاریخ میں ایم۔اے کیا۔ پھر جرمنی گئے۔ واپسی کے بعد ان کے لیے متعدد جگہیں نکلیں، مگر انھوں نے اپنی خدمات جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کو سپرد کردیں اور غالباً سنہ ۱۹۲۶ء سے مستقل وہیں ہیں اور اب شیخ الجامعہ ہیں۔ مجیب صاحب شروع ہی سے نیشنلسٹ رہے اور قومی خدمت کو زندگی کا شعار بنایا مگر وہ ٹھوس کام کرنے کے قائل ہیں اور نام و نمود کی خاطر کوئی کام نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے وہ ہر دلعزیز ہیں۔ مجیب صاحب سادہ طرز تحریر میں ایک صاحب طرز سمجھے جاتے ہیں۔ الفاظ مناسب، باموقع، شستہ اور مختصر استعمال کرتے ہیں، جس میں ایک قسم کی حلاوت، معصومیت، سادگی اور پختگیٔ خیال معلوم ہوتی ہے۔ ان کے چھوٹے ڈرامے بہت مقبول ہیں۔

# انجام

## پہلا منظر

شیخ نجم الدین کے مکان کا کمرہ فیشن کا خیال رکھتے ہوئے آراستہ کیا گیا ہے۔ دری اور اس پر قالین، بیچ میں میز اور اس کے گرد پانچ چھ کرسیاں، میز پر کاغذ کے پھولوں کا گلدستہ، دائیں طرف ایک آرام کرسی۔ داخلہ کا ایک دروازہ دائیں طرف، دوسرا بائیں جانب۔ شکراللہ ایک کرسی پر بیٹھا کسی رسالہ کے ورق الٹ رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں شیخ نجم الدین اچکن ٹوپی پہنے، ہاتھ میں چھڑی لیے دائیں دروازہ سے اندر آتے ہیں۔ شکراللہ کھڑا ہو کر سلام کرتا ہے۔ شیخ صاحب اطمینان سے اچکن ٹوپی اتار کر معروف کو دے دیتے ہیں، جو ان کے پیچھے اندر آتا ہے۔ (خاموشی)

شیخ نجم الدین : دیکھو شکراللہ، تم اور رکنو دونوں آج فجر کی نماز کے لیے پھر نہیں اٹھے۔

(شکراللہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے)

شیخ نجم الدین : مجھے تم سے بار بار کہتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہوتا، مگر یہ بات بہت بری ہے۔ صبح کو اٹھنا کچھ ایسا دشوار نہیں ہے، جب تم رات کو وقت سے سو جاتے ہو۔ میرے

خیال میں تم تہجد کے لیے بھی چاہو تو اٹھ سکتے ہو ..... بندے خدا کو خوش کرنے کے لیے جتنی بھی تکلیف اٹھائیں وہ کم ہے اور جن فرائض کو ہم بغیر تکلیف اٹھانے ادا کر سکیں ، ان میں تو کبھی غفلت کرنا ہی نہ چاہیے - یہ تو مفت میں خدا کو ناراض کرنا ہے .... کیوں ، کچھ بولتے کیوں نہیں ؟

شکر اللہ : جی ہاں ، آپ بجا فرماتے ہیں -

شیخ نجم الدین : اچھا ، تو پھر دیکھو ، آج سے ناغہ نہ ہونے پائے - رکنو سے بھی کہہ دینا -

شکر اللہ : جی بہت اچھا -

(خاموشی)

شیخ نجم الدین : معروف

معروف : جی حضور !

شیخ نجم الدین : دیکھو ، میرے حجرے میں وہ بڑا ہزارہ رکھ دو ، آج لمبے وظیفے کا دن ہے -

معروف : بہت اچھا حضور -

شیخ نجم الدین : اور سنو ! تمہارے پاس وہ پرچے جو ہیں جن پر نیا وظیفہ لکھا ہے ، وہ جا نماز پر رکھ دینا اور وہ تعویذ سرہانے رکھ دیا ہے نا ؟

معروف : جی حضور -

شیخ نجم الدین : اور گلے میں باندھنے کے جو تعویذ ہیں انہیں اندر دے دیا ہے ؟

معروف : جی حضور - بٹیا صاحبہ نے کہا ہے ایک گھنٹہ کے اندر تیار کر دیں گی -

شیخ نجم الدین : اچھا توغسل خانے میں پانی رکھ دو - (اٹھ کر اندر چلے جاتے ہیں - (شکر اللہ پہلے کی طرح رسالہ کے ورق الٹنے لگتا ہے) -

(تھوڑی دیر بعد معروف آتا ہے کرسیاں جھاڑنے لگتا ہے) -

معروف : (ٹھنڈی سانس بھرکر) بزرگوں کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں -

شکر اللہ : کیوں کیا ہوا ؟

معروف : کیا بتاؤں صاحب ، کہنے کی بات نہیں ، آپ تو جانتے ہیں ہم لوگ جاہل ہیں - نماز وماز آپ لوگوں کے سکھانے سے پڑھنے لگے ہیں ، نہیں تو ہم کو کیا تمیز تھی -

شکر اللہ : اچھا تو ؟

معروف : کیا کہوں صاحب یہاں ایک اندھے فقیر ہیں - وہ روز بھیک مانگتے ادھر سے نکلتے ہیں مگر ہمارے یہاں سے کچھ نہیں لیتے - کہتے ہیں بڑے پاپی کا گھر ہے - مجھے معاف کرو ، میں یہاں سے کچھ نہیں لے سکتا - میں نے بہت خوشامد کی - یہ بھی کہا کہ شاہ صاحب ہمارے یہاں تو سب نمازی ہیں ، مگر وہ مانتے ہی نہیں - کہتے ہیں نا بابا ! یہ تو بڑے پاپی کا گھر ہے ، میں کچھ نہیں لیتا -

شکر اللہ : تو یہ ان کی عنایت ہے۔ اس میں شکایت کی کیا بات ہے ؟

معروف : صاحب آپ تو ''تالیم آفتہ'' ہیں آپ ایسے لوگوں کو مانتے نہیں، ہم جاہل لوگ انہیں بڑا ولی سمجھتے ہیں - اب تو وہ اندھے ہوگئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں پہلے بڑے عالم تھے، ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔ اب بھی کوئی مولوی وولوی ان کے سامنے منہ نہیں کھول سکتا مگر وہ بھیک مانگتے پھرتے ہیں، اس لیے کوئی انہیں پوچھتا نہیں . . . . میں تو انہیں بہت بڑا آدمی سمجھتا ہوں اور میری جان پہچان کے جتنے لوگ ہیں سب انہیں شاہ صاحب، شاہ صاحب کہہ کہہ کر پکارتے ہیں اور انہیں یہاں تک مانتے ہیں کہ ان کے لیے جان دینے کو تیار ہیں۔

شکر اللہ : اچھا !

معروف : جی ہاں صاحب۔ اس میں کیا شک ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ میاں مولوی صاحب کی جگہ ان کے پاس جایا کریں تو بہت اچھا ہو، مگر ان سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ آپ کہہ دیں تو شاید مان بھی جائیں۔

شکر اللہ : معاف کرو۔ بھائی، یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ تمہیں ان سے کہو۔ دو چار کرامات بھی بیان کر دو تو ماموں جان جلدی سے راضی ہو جائیں گے۔

معروف : نہیں صاحب میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں۔ ( رکن الدین

داخل ہوتا ہے اور چپکے سے شکر اللہ کے پاس بیٹھ جاتا ہے ۔)

رکن الدین: کہو کیسی ڈانٹ پڑی!

شکر اللہ : کہیں بھی نہیں ۔ تم کو البتہ کہا تھا کہ نہ اٹھیں تو لوٹا بھر کے ٹھنڈا پانی آنڈیل دو ، تب ضرور اٹھیں گے ۔

رکن الدین: جی ہاں!

شکر اللہ : اچھا نہ مانو ، کل صبح دیکھ لینا ۔
(خاموشی)

(پردہ)

# ڈاکٹر عابد حسین

عابد صاحب جولائی سنہ ۱۸۹٦ء میں بہ مقام بھوپال پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی اور عربی اپنے والد سید حامد حسین سے پڑھی۔ بعض بزرگ خاندان انھیں مجتہد بنانا چاہتے تھے اور عربی و فارسی تعلیم دلانے پر زور دے رہے تھے۔ اسی کش مکش میں ۱۳، ۱۴ برس ضایع ہوگئے۔ بالآخر سنہ ۱۹۱٦ء میں میٹرک میں بھوپال ہی سے اول درجہ میں کامیاب ہوکر وظیفہ یاب ہوئے اور میور سنٹرل کالج الہ آباد چلے گئے جہاں سے انھوں نے بی۔ اے، اول درجہ میں پاس کیا۔ الہ آباد مسلم بورڈنگ کے میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ ایم۔ اے کے لیے وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ آئے جہاں سے ایک سال رہ کر جرمنی چلے گئے اور فلسفہ میں پی ایچ۔ ڈی کیا۔ وہاں ان کا ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور محمد مجیب صاحب سے ہوا، جن سے متاثر ہوکر یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی آگئے اور اب تک وہیں ہیں۔ سال ڈیڑھ سال کے لیے وہ تصنیف اور تالیف کے سلسلہ میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ چلے گئے تھے، مگر اب پھر دہلی واپس آگئے۔

پردہ غفلت ان کا ایک اصلاحی ڈرامہ ہے ، جسے عابد صاحب نے جرمنی میں لکھا تھا ۔

انجمن ترقی اردو میں مولوی عبدالحق صاحب نے جو انگریزی اردو ڈکشنری تیار کرائی تھی اس میں عابد صاحب کا بڑا حصہ ہے ۔ عابد صاحب ایک سخن فہم شاعر بھی ہیں لیکن انھوں نے اسے ذریعہ شہرت نہیں بنایا ۔ ان کی نثر بڑی چوکھی اور صاف ستھری ہوتی ہے ۔

# پردہ غفلت

## دوسرا ایکٹ

### پہلا سین

(ایک اونچی کرسی کا دالان ہے۔ تختوں کی چوکی پر سفید چاندنی بچھی ہے اور صدر میں قالین اور گاؤ تکیہ ہے۔ میر الطاف حسین تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک چھوٹی سی تپائی پر حقہ رکھا ہے۔ تخت کے ایک سرے پر احمد حسین، ایک تکیہ دار مونڈھے پر شیخ کرامت علی اور دو کرسیوں پر محمد محسن اور منظور بیٹھے ہیں۔

احمد حسین : دولہا میاں! سنا ہے کہ کلکٹر صاحب کی بدلی ہونے والی ہے۔

محسن : یہ خبر یہاں تک تو صحیح ہے کہ احکام صادر ہوگئے تھے بلکہ گزٹ بھی ہوگیا تھا لیکن اس کے بعد کی کارروائی لوگوں کو معلوم نہیں۔ وہ حکم منسوخ ہوگیا، اورصاحب بدستور یہاں رہیں گے۔

احمد حسین : آخر یہ کیسے؟ سنا کرتے تھے کہ گورنمنٹی احکام نادری ہوتے ہیں اور کسی کے ٹالے نہیں ٹلتے۔

محسن : معلوم نہیں ''موز مملکت خویش خسروان دانند۔''

احمد حسین : نہیں دولہا میاں آپ کو ضرور معلوم ہے لیکن آپ بتانا نہیں چاہتے۔

محسن : نہیں صاحب میں کیا جانوں۔

احمد حسین : بس اب یہ باتیں رہنے دیجیے۔ آپ کو صاحب اور میم صاحب دونوں جتنا مانتے ہیں وہ کس سے چھپا ہے۔ بھلا کوئی بات ہے کہ انھوں نے آپ سے نہ کہا ہو!

محسن : (مسکرا کر) آپ سے کس نے کہا کہ صاحب مجھے مانتے ہیں؟ خیر! اب آپ پوچھنا ہی چاہتے ہیں تو سنیے، کوئی دو ہفتہ ہوئے میم صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ ناظر ہم بڑا پریشان ہے، صاحب کا بدلی ہونے کا حکم ہو گیا ہے اور ہم جانا نہیں چاہتا۔ ہم کو یہاں کا آب و ہوا بہت پسند ہے اور دوسرے اس ضلع کا زمیندار لوگ بڑا اشراف ہے۔

احمد حسین : سچ کہیے، یہ کہتی تھیں میم صاحب؟

محسن : اور نہیں کیا میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں! خیر، تو میم صاحب کہنے لگیں، ناظر آپ کوئی ترکیب بتایے کہ صاحب یہاں رہ جائے۔ میں نے کہا "حضور یہ کتنی بڑی بات ہے۔ آپ کے اقبال سے آج ہی حکم تبادلہ منسوخ ہو جائے گا۔" بس حضرت وہاں سے آتے ہی میں شہر کے وکلاء اور دوسرے معززین اور با اثر لوگوں سے ملا اور دو تار ایک ہندوؤں اور ایک مسلمانوں کی طرف سے لاٹ صاحب کو دلوا دیے کہ محرم میں بلوے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، اگر یہ کلکٹر صاحب یہاں

نہ ہونے تو خوں ریزی کا اندیشہ ہے ۔ شام کو بارگاہ لفٹنٹی سے ارجنٹ تار پہنچا کہ تا حکم ثانی تبادلہ موقوف ۔ یہ ہے سارا قصہ، مگر اسے اپنے ہی تک رہنے دیجیے گا ۔ اب تک سوائے چند لوگوں کے کسی کو خبر نہیں ہے ۔ صاحب خود یہ سمجھتے ہیں کہ واقعی فساد کا اندیشہ ہے ۔ لوگوں سے دھڑا دھڑ مچلکے لے رہے ہیں ۔

احمد حسین : کیوں نہ ہو دولہا میاں، آخر آپ کس باپ کے بیٹے ہیں ۔ آپ کے والد نے اپنی تحصیلداری کے زمانے میں ایک جنٹ کو بدلوا دیا تھا ۔ آپ نے کلکٹر کو روک لیا ۔

شیخ جی : واہ ناظر صاحب واہ ! رام مورتی کو سنا کرتے تھے کہ موٹر روک لیتا ہے، آپ نے کلکٹر کو روک کے دکھایا ۔

میر صاحب : مگر سنو تو ! تم نے خلاف واقعہ تار دلوایا تو گویا سرکار کو دھوکا دیا ۔

محسن : جی نہیں دھوکے کی کیا بات ہے ۔ محرم میں ہندو مسلمان کی نزاع تو طے شدہ امر ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ ہمارے صاحب جس طرح ان معاملات کو بہ احسن وجوہ سلجھا سکتے ہیں اور کسی سے نہ بن پڑے گا ۔

شیخ جی : ارے یہ کیا ۔ اگر یہ سچ تھا تو آپ کی تعریف ہی کیا ہوئی ۔ احمد حسین اسے حکمت تھوڑی کہیں گے ۔

احمد حسین : بس آپ کے نزدیک تو میں دنیا بھر کا جھوٹا ہوں اور جھوٹوں کا قدردان ۔

شیخ جی : نہیں توبہ کرو ، اگر تم جھوٹے ہوتے تو ہمارے میر صاحب تمہیں اپنا سیکریٹری امور دنیا نہ بناتے اور مقدمہ والے تمہیں گواہی میں کیوں لکھایا کرتے ۔ (محسن سے) ہاں صاحب تو آپ نے فقط سچا تار دے کر کلکٹر صاحب کو روکا ۔ خیر روک تو لیا ۔

منظور : میاں محسن تم نے ضرور تار دلوایا ہوگا، لیکن مسٹر فریزر کا تبادلہ منسوخ ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کی جگہ پر جو شخص آرہا تھا وہ دفعتاً بیمار ہوگیا اور چھٹی لے کر انگلستان جانے والا ہے ۔

محسن : تم سے یہ کس نے کہا ؟

منظور : محمد علی نے ، اُن سے خود مسٹر فریز سے باتیں ہوئی تھیں ۔

محسن : بس معلوم ہو گئی حقیقت ۔ ایسا ہے تو محمد علی کا کلکٹر صاحب سے یارانہ ہے ۔

منظور : یارانہ کاہے کو ہونے لگا؟ ان دونوں میں تو ہمیشہ سے ان بن ہے ۔ محمد علی نے جب سے کاشت کاروں کی انجمن قائم کی ہے ، سارے حکام اُن کے جانی دشمن ہیں ۔ فریزر کا منشا ان کو یہ خبر سنانے سے یہ تھا کہ تم میرے جانے سے بہت خوش تھے ، اب سن لو کہ میں ٹلنے والا نہیں ۔

محسن : کیسی بچپن کی باتیں کرتے ہو! حاکم ضلع دشمن ہوتا اور محمد علی ضلع میں رہنے بھی پاتے۔ سب انجمن ونجمن رکھی رہتی اور صاحب زادے کو بوریا بدھنا سمیٹنا پڑتا۔

منظور : کیوں؟ حاکم ضلع کو اختیار ہے کہ جسے چاہے ضلع سے نکال دے؟

محسن : یوں اختیار نہیں ہے تو کیا ہوا۔ وہ سو بہانے سے باغیوں کو کچل سکتا ہے۔

شیخ جی : مثلاً بقرعید کا مچلکہ لے کے۔

منظور : (غصہ کے لہجے میں محسن سے) تمھارے نزدیک تو کلکٹر (محمد جواد کے داخل ہونے سے سب لوگ ادھر متوجہ ہو جاتے ہیں اور سلسلہ کلام منقطع ہو جاتا ہے۔)

احمد حسین : آیے آیے ہیڈ مدرس صاحب۔ کب سے آپ کا انتظار ہے۔

محمد جواد : (نہایت جھک کر سب کو سلام کرتے ہیں۔) تسلیمات عرض ہے۔ ناظر جی کی خدمت میں آداب (شیخ جی سے) بندگی (احمد حسین سے) مجرا (منظور سے) کورنش۔

(سب لوگ سلام کاجواب دیتے ہیں۔)

میر صاحب : جیتے رہو۔ کہو آج تمھارے مکتب میں تعطیل ہے نا!

محمد جواد : اجی تعطیل کیسی قبلہ و کعبہ۔ ملازمان سرکاری اور خصوصاً عمالِ سر رشتہٴ تعلیمات مغربي وشمالي

کو تعطیل کہاں - پرسوں ڈپٹی صاحب بہ غرض معائنہ تشریف لائیں گے۔ صبح سے مصروف دوڑ دھوپ تھا - طالب علموں کو جمع کیا - مدرسہ کے سامنے کی گھاس چھلوائی ، درجوں کے اندر زمین کو لپوایا۔ درجہ چار میں چوہوں کے بل تھے انھیں بند کرایا ، بہت سی بنچیں گاؤں والے مانگ لے گئے تھے اُن سے واپس منگائیں۔ غرض بے انتہا عرق ریزی کے بعد اب مدرسہ اس قابل ہوا ہے کہ خوشنودی حکام بالا دست کی حاصل کرے - ”از خرداں خطا و از بزرگاں عطا -“

شیخ جی : بلکہ ، حکم حاکم مرگ مفاجات -

(میر صاحب مسکرانے لگتے ہیں اور محسن اور منظور بہ مشکل ہنسی کو روکتے ہیں -)

احمد حسین : سنا ہے ڈپٹی صاحب سخت آدمی ہیں۔

محمد جواد : دیکھیے کیسے نکلتے ہیں ، ناچیز کا تو ان سے پہلا سابقہ ہے - سب مدرسوں کو تاکید کر دی ہے کہ سبق سب شاگردوں کو اچھی طرح نوک بر زبان کرا دیں - اب تک تو ڈپٹی صاحبان کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ ہیڈ مدرس کو حکم دیتے ہیں کہ سوال کرے اور ہم لوگ اسی سبق میں سے پوچھتے ہیں جو لڑکوں کے ذہن نشین پہلے سے ہوتا ہے -

شیخ جی : کہیں پار سال کا سا واقعہ نہ ہو جب انسپکٹر صاحب معائنہ کو آئے تھے - آپ نے لڑکے سے کہا

کہ برٹش حکومت کی برکات بیان کرو، وہ لگا قحط کے اسباب بتانے ۔

محمد جواد : نہیں وہ تو حسن اتفاق کی بات تھی ۔ وہ لڑکا کئی دن سے غیر حاضر رہا تھا، اسے معلوم نہ تھا کہ کونسا سبق یاد کرایا گیا ہے ، کسی دوسرے ہم سبق سے پوچھا ، اس نے اناپ شناپ بتا دیا ۔ مگر اس دن بھی خیریت ہو گئی۔ انسپکٹر صاحب رائے بہادر سے باتیں کر رہے تھے ۔ انھوں نے سنا نہیں ورنہ خدا جانے کیا ہوتا ۔

شیخ جی : ہوتا کیا ، لڑکے سے ، اس کے ماں باپ سے اور آپ سے مچلکہ لے لیتے ۔

محمد جواد : شاہاں چہ عجب ! گر بنوازند گدارا ۔ ۱ میں نے صاحب کے جانے کے بعد دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھی ۔

شیخ جی : اور سچ کہیے آن کے آنے سے پہلے نماز خوف پڑھی تھی کہ نہیں ۔

محمد جواد : یہ تو نہیں مگر جوشن کبیر میر صاحب سے لکھوا لے گیا تھا وہ بازو پر بندھا تھا ۔

شیخ جی : تو اب کی مرتبہ ڈپٹی صاحب کے لیے جوشن صغیر لکھوا لے جائیے ۔

میر صاحب : شیخ جی آپ دنیوی باتوں میں چاہے جتنا مذاق کیجیے امور دین کا مضحکہ آپ کی بزرگی کے شایاں نہیں ہے ۔

---

۱ - بادشاہوں سے بعید نہیں کہ فقیروں پر مہربانی کریں ۔

شیخ جی : میں ہیڈ مدرس صاحب سے اُن کے مذاق کی باتیں کر رہا ہوں ، آپ کیوں دخل دیتے ہیں - آپ اعتراض کریں گے تو مجھے معقول جواب دینا پڑے گا اور اس سے میں حتی‌الامکان پرہیز کرتا ہوں -

میر صاحب : آپ کو اس کا تو خیال کرنا چاہیے کہ جب آپ ایسی باتیں کریں گے تو ان نوجوانوں پر کیا اثر پڑے گا -

شیخ جی : انھیں نوجوانوں کی فکر تو میرے لیے کاہش جاں ہو رہی ہے - یہ غریب بچپن سے مغربی عقلیت کے سایہ میں پلے ہیں اور عقیدت اور معرفت کی روشنی کو جو قلب کے ناپیدا کنار صحرا میں بہت دور چمکتی ہے علم کی نزدیک بین عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں ، اور جب کچھ نظر نہیں آتا تو کہتے ہیں یہاں تاریکی کے سوا کچھ نہیں - مگر قانون فطرت کے خلاف باوجودیکہ یہ روشنی بہت دور ہے اس کی حرارت قلب کے ہر حصے میں محسوس ہوتی ہے اور اسی نے اہل مغرب کو حیرت میں ڈال رکھا ہے کہ اگر روشنی نہیں ہے تو یہ حرارت کیسی ؟ رہے ہمارے نوجوان تو ان کا علم اور شک دونوں مانگے کے ہیں ، اس لیے انھیں یہ حیرت بھی نصیب نہیں - یہ تو ہے ان کی حالت اور اس پر طرہ یہ ہے کہ کتابی مذہب کو جس سے ان کم نگاہوں کو نظر ملنے کی امید ہوسکتی ہے آپ لوگوں نے چھومنتر بنا رکھا ہے - مذہب کی حقیقت قرار دی ہے عبادت

ظاہری اور عبادت کا مقصد زندگی کے ادنیٰ مقاصد
کا حصول ! پھر اگر یہ لوگ اس سے دور رہیں
تو کون سی تعجب کی بات ہے۔

میر صاحب : مگر شیخ جی ! حُوشنین کی فضیلت میں روایات
صحیحہ ۱ موجود ہیں۔

شیخ جی : بس رہنے دیجیے اپنی روایات صحیحہ۔

احمد حسین : (اٹھ کر) حضرت مجھ سے تو یہ کفر نہیں سنا
جاتا ، میں تو رخصت ہوتا ہوں۔

محمد جواد : شیخ جی ، آپ کا سا بزرگ اور ایسی باتیں کرے،
بڑے تعجب کی جگہ ہے۔
میں آپ سے خرد سال ہوں لیکن اگر حکم ہو تو
منطق فلسفہ سے خدا کا وجود ثابت کردوں۔ درجہ
سات کی سائنس ریڈر تک میں بسم اللہ الرحمن الرحیم
لکھا ہے۔ شیخ سعدی ، کہتے ہیں ...... اس
وقت یاد نہیں آتا۔

شیخ جی : الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا ۲

محمد جواد : نہیں وہ اور شعر ہے۔ چوں سے شروع ہوتا ہے۔

شیخ جی : بھئی ! میں تو چوں چرا سے خدا کے وجود کو نہیں
ثابت کرسکتا ، البتہ اگر ضرورت پڑ جائے تو خدا
کے وجود سے چوں چرا کو ثابت کر دوں گا۔
(نوکر داخل ہوتا ہے)
حضور! اندر سے کہلا بھیجا ہے کہ کھانا تیار ہے۔

---

۱ - روایات صحیحہ : وہ بیانات جو صحیح مانے گئے ہوں۔
۲ - ہاں اے ساقی پیالے کو دور میں لا اور اسے (پینے والوں کو) دے۔

میر صاحب : اچھا کہہ دو آتے ہیں ۔ (اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اُن کے ساتھ منظور ، محسن ، احمد حسین اور جواد بھی) ۔

میر صاحب : میاں محمد جواد تم بھی یہیں شیخ جی کے ساتھ ساتھ کھانا کھاؤ ۔ شام کو چلے جانا ۔

محمد جواد : نہیں قبلہ و کعبہ مجھے جانے دیجیے بہت کام کرنا ہے ۔

شیخ جی : اجی ٹھہریے بھی! آپ کے ساتھ کھانا کھانے میں لطف آئے گا ۔ آپ کے ماتحت مدرس ہیں ، لیپ پوت کر لیں گے ۔

احمد حسین : نہیں جواد میاں تمھیں ٹھہرنا پڑے گا ۔ میں کھانا بھیجتا ہوں ۔

# سید امتیاز علی تاج

سید صاحب کی پیدائش لاہور کی ہے ۔ آپ کے والد شمس العلماء سید ممتاز علی صاحب تھے ۔ انھوں نے دو رسالے جاری کیے، ایک عورتوں کے لیے جس کا نام "تہذیب نسواں" تھا، دوسرا بچوں کے لیے جس کا نام "پھول" تھا۔ اس لیے ان کے گھر کا ماحول ادبی تھا اور اسی وجہ سے یہ خود شروع ہی سے لکھنے پڑھنے میں بڑی دلچسپی لیتے رہے ۔

شروع میں امتیاز علی تاج نے ترجمے کیے، پھر افسانے لکھے اور اردو کے مزاحیہ ادب پر چچا چھکن کا کردار تخلیق کیا ۔ اصل یہ ہے کہ اردو ادب میں مرزا ظاہردار بیگ اور حاجی بغلول کے بعد سے مشہور مزاحیہ کردار چچا چھکن ہی ہے ۔

تاج صاحب کا ادبی شاہکار ڈراما "انارکلی" ہے ۔ یہی ان کی ادبی زندگی کا شہ پارہ کہا جا سکتا ہے ۔ یہ بیسوی صدی کے اردو ادب میں ایک ممتاز ڈراما ہے ۔ اس میں انھوں نے اپنی تحریر سے ماضی کو زندہ کردیا ہے اور کچھ اس انداز سے بیان کیا کہ ہم کو خود اپنی آنکھوں سے دکھا دیا ہے ۔ یہ ہر حیثیت سے بڑا

کامیاب ڈراما ہے ۔ اس میں وحدت زمان و مکان بھی ہے اور وحدت تاثر بھی۔ اس میں انھوں نے معمولی سے معمولی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ۔ ان کا ڈراما انارکلی پڑھ کر پڑھنے والے کا دل پکار اٹھتا ہے کہ سچ یہ ہے کہ تاریخ ہی ادب کا رومان ہے ۔

# انار کلی کے دیوار میں چنے جانے کے بعد

## ثریا اور سلیم کا تاثر

---

(حرم کے دروازے سے ثریا داخل ہوتی ہے اور سامنے چبوترے پر چپ چاپ کھڑی ہو جاتی ہے)۔

(سلیم ثریا کو دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔)

ثریا! ۔ ننھی! تو رو نہیں ۔ وہ زندہ ہے؟

(سلیم ثریا کی طرف بڑھتا ہے)

ثریا : (وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ اٹھا کر) میرے قریب نہ آ!

سلیم : (حیرت میں) کیا؟

ثریا : دور کھڑا رہ!

سلیم : ثریا!

ثریا : تیمور کی نامراد اولاد! ہندوستان کے بزدل ولی عہد! میری بہن کی جان لے کر تو ابھی زندہ موجود ہے۔ پھول کو کھا جانے والے کیڑے، تونے اُس کی جان کو اپنی جان کہا تھا ۔ جھوٹے، تونے اس کو بچا لینے

گا وعدہ کیا تھا - بے حیا ، اس کوشش میں تونے اپنی جان تک دے دینے کو کہا تھا ! اور سب قول یوں پورے ہوئے ؟ جوان انار کلی کے ، انار کلی کی بڑھیا ماں کے ناپاک قاتل - تجھ پر بے کس کا صبر ٹوٹے ، تجھ کو مظلوم کی آہیں پھونکیں - تجھ کو بے بس کے آنسو غرق کریں -

بختیار : لڑکی ، خاموش خاموش -

سلیم : (سر جھکا کر) ثریا دنیا کی کوئی لعنت کوئی بد دعا باقی نہ چھوڑ اور جب تیرا دل بھر جائے تو صرف اتنا کر ، مجھے اپنی انار کلی کے راستے پر لگا دے - میری ثریا ! میرا راستہ کھو گیا - ننھی ، تیری انار کلی کا سلیم رستے پر پڑ چکا تھا ، مگر لٹ گیا ، بے بس کر دیا گیا -

ثریا : ظالم اکبر کے دروغ گو بیٹے - تجھے راستہ نہیں ملتا ، میری جیتی جاگتی بہن کے گرد دیوار چن ڈالی گئی - وہ ناشاد زندہ گاڑ دی گئی - اس کی سلیم سلیم کی آخری چیخیں آسمان میں شگاف کرتی رہیں - وہ گڑتی چلی گئی اور سلیم کے سوا اس کے منہ سے کسی کا نام نہ نکل سکا - اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں اینٹوں میں چھپ جانے سے پہلے صرف تجھ کو ، تیری نجس صورت کو ڈھونڈتی رہیں اور تو یہاں پردوں میں گدیلوں پر جان کو لیے بیٹھا ہے -

سلیم : (آنکھیں پھٹی پڑ رہی ہیں) زندہ دیوار میں ! پناہ تیری پناہ ! میرے گرد کس جہنم کا منہ کھل گیا - میری آنکھوں کے سامنے چڑیل تونے کس ہیبت کا نقشہ کھینچ دیا -

ثریا : وہ تھرتھرائی ہوئی نازنین پتھروں میں ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئی ۔ اس کا دھڑکتا ہوا دل ، دوڑتا ہوا لہو دیوار میں غرق ہونے کے بعد تھم گیا اور تجھے اس کا راستہ نہ ملا ، موت نہ آئی ؟

سلیم : ( پاگلوں کی طرح کبھی اپنے سے کبھی بختیار سے ) دیوار بند ہو گئی ۔ اس پر دیوار بند ہو گئی ! وہ پتھروں میں ڈوب گئی ۔ ہمیشہ کے لیے ڈوب گئی ۔ میرا دم گھٹا ، دم گھٹا ۔ پتھروں میں رکا ہوا سانس ، بند نظر میں تھما ہوا لہو مجھے پکار رہا ہے ، چیخ چیخ کر پکار رہا ہے ۔

بختیار : ( سلیم کو آغوش میں لے کر ) سلیم تمھیں کیا ہو گیا ۔ نامراد لڑکی تو نے کیا کر دیا ؟

ثریا : خوشامدی کتے ! میری بہن کی روح دوسرے جہان میں اس کے لیے بے تاب ہے ۔ میں اسے یوں ہی چھوڑ دوں گی ؟ میں اپنے آخری سانس کو اس کے لیے لعنت بناؤں گی ، میں اس کے لیے زندگی کو موت سے بدتر بنا دوں گی ، میں اسے خود کھینچ کر موت کے منہ میں لے جاؤں گی ۔ ( سلیم بختیار کے آغوش سے یک لخت الگ ہو کر دیوانہ وار دروازے کی طرف بڑھتا ہے ۔ )

بختیار : ( اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے ) سلیم کہاں جا رہے ہو ؟

سلیم : میں اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا ۔ اس محل کو ، اس قلعے کو کھنڈر بنا دوں گا ۔ پتھروں کو اگلنا ہوگا ۔ میری انارکلی کا جو کچھ باقی ہے وہ اگلنا ہوگا ۔ میرا آغوش اپنی جان اس کے جسم میں ڈالے گا ۔ ورنہ ایک

ہی کھنڈر پر دونوں چمٹ کر تمام ہوں گے ۔

بختیار: راہ بند ہے ۔

سلیم : ( مڑکر دروازہ کی طرف بڑھتا ہے ) راہ بند ہے تو میری ٹکریں راہ بنائیں گی ۔ ( پردہ دیوار پر سے نوچ ڈالتا ہے ۔ دیکھتا ہے ، تو پیچھے دلآرام سہمی ہوئی کھڑی اس کے جنون کو دیکھ کر کانپ رہی ہے ۔ سلیم پاگلوں کی طرح اسے تکتا رہتا ہے ۔) انارکلی ! تو دیواروں ہی دیواروں میں سے میرے پہلو میں آ پہنچی !

دلآرام: ( خوف کے مارے گلا خشک ہے ) صاحب عالم !

ثریا : اندھے یہ انارکلی ہے یا وہ سموم جس نے انارکلی کو پھونک ڈالا !

دلآرام ! انارکلی کی قاتل تیرے سامنے کھڑی ہے ۔ اس نے انارکلی کو گرفتار کرایا ۔ جشن کی رات یہ اکبر کے حضور میں موجود تھی ۔ اس نے قتل کا حکم دلوایا ۔ کل کی رات یہ اکبر کی خواب گاہ میں گئی تھی ۔ انارکلی کا سانس بند ہے اور یہ سانس لے رہی ہے ، انارکلی کے جسم سے زندگی کی آخری رمق مٹ چکی اور اس کے جسم میں لہو جاگ رہا ہے ۔ مار ! مار ! میرا کلیجہ ٹھنڈا کر ۔ انارکلی کی جلن کو مٹا ۔

دلآرام: ( تھر تھر کانپتے ہوئے ) میں نے موت کی سزا نہیں دلوائی ، داروغۂ زنداں نے دلوائی ہے ۔
میں بے قصور ہوں ، بے قصور ہوں ۔

سلیم : ( لپک کر اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا ہے اور دبانا شروع کرتا ہے ) آخرکار ۔ آخرکار انارکلی کو

گھونٹ ڈالنے والے پتھر تو مجنوں سلیم کے ہاتھ آگیا۔ اب اس کے ہاتھ تیرے خون کی ایک ایک بوند سے انارکلی کا انتقام لیں گے۔

بختیار: (سلیم کو الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔) دیوانے ہوگئے ہو میرے سلیم! میرے شہزادے! (دلآرام پر سلیم کی گرفت بہت مضبوط ہے۔)

ظل الہیٰ! (گھبرا کر اکبر کو اطلاع دینے جاتا ہے۔)

سلیم: (گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے) ان آنکھوں کی چمک کہاں گئی؟ ان گالوں کی سرخی اور تازگی کیا ہوئی؟ (ایک خشک اور بے رس قہقہہ لگا کر دلآرام کو نیچے پٹخ دیتا ہے، خود مسند پر بیٹھ کر ہانپنے لگتا ہے۔ ثریا چبوترے پر آنکھیں بند کیے چپ چاپ کھڑی ہے۔) (اکبر باہر کے دروازے سے گھبرایا ہوا داخل ہوتا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر سلیم کے قریب آتا ہے۔)

اکبر: شیخو یہ کیا! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟

سلیم: (کچھ دیر چپ چاپ اکبر کو تکتا رہتا ہے) تم کون ہو؟

اکبر: (فکر مند نظروں سے) شیخو! اپنے باپ کو پہچانو۔

سلیم: (سر ہلا کر منہ موڑ لیتا ہے) شیخو کا کوئی باپ نہیں۔ وہ مر چکا۔ تم ہندوستان کے شہنشاہ ہو۔ جہانبانی کے باپ، دولت کے باپ۔ تم قاتل ہو۔ انارکلی کے قاتل! سلیم کے قاتل۔ تمھاری پیشانی پر خون کی لہریں ہیں۔ تمھاری آنکھوں میں جہنم کے شعلے ہیں۔ تمھارے سانس میں نعش کی بو ہے!

اکبر : ( ایک رنگ چہرے پر آتا اور ایک جاتا ہے ۔ ) شیخو ! میرے بچے ہوش میں آؤ ۔

سلیم : شیخو تمھارا بچہ نہیں ۔ دیکھو تمھاری بیٹی وہ پڑی ہے ( دلآرام کی طرف اشارہ کرتا ہے ) جاؤ اس سے لپٹو اور اس پر آنسو بہاؤ ۔

اکبر : دلآرام ۔

سلیم : ہاں تمھارے قید خانے کی کلید ۔ تمھارا خون کا فرمان ، تمھارا کچل ڈالنے والا پتھر !

اکبر : ( آنکھیں بند کر کے ) خداوندا ! یہ دن بھی دیکھنا تھا ۔

سلیم : اس کی سرد نعش میں روح یہ کہنے کو رکی ہوئی ہے کہ میں نے سلیم کو چاہا اور اس نے انکار کیا ۔ اس نے انار کلی کو چاہا اور میں نے انتقام لینے کے لیے انار کلی کو برباد کیا ۔ جاؤ ، اس سے یہ سنو اور کلیجہ ٹھنڈا کرو اور پھر اپنے فرزند داروغہء زنداں کو بلا لاؤ ۔ اس پیسہ کے کمینہ غلام کو جس نے دولت پر انار کلی کو بیچنا چاہا اور تمھارے ہاتھ اس نے بیچ ڈالا کہ تم زیادہ امیر تھے ۔

اکبر : ( کھوئی ہوئی نظروں سے سامنے تکتے ہوئے ) شیخو یہ سچ ہے ؟ ( غضب ناک ہو کر ) اس سے انتقام لیا جائے گا ۔

ثریا : اس سے ؟ اور شہنشاہ تم سے نہیں ؟ تم بچ جاؤ گے ؟ آسمان نہ ٹوٹے ، بجلیاں نہ گریں ، زلزلے نہ آٹھیں ، لیکن یہ چنگاری جیسے دوزخ کی ہوائیں سرخ کر رہی ہیں تم کو ، تمھارے محلوں کو ، تمھاری سلطنت کو ، سب کو پھونک کر راکھ بنا دے گی ۔ (ثریا غصے سے

سیڑھیاں اتر کر اکبر کی طرف بڑھتی ہے مگر پاس پہنچنے کے بعد جب اکبر اس پر نظر ڈالتا ہے تو سہم جاتی ہے اور ''آہ'' کہہ کر بے ہوش ہو جاتی ہے ۔)

اکبر : (سلیم کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے ۔ سلیم سکڑا ہوا آنکھیں بند کیے چپ چاپ بیٹھا ہوا ہے ۔) سلیم تم ہوش میں آگئے ؟ تم سن سکتے ہو؟ سمجھ سکتے ہو ؟

سلیم : (ہلکی آواز میں) مجھے کچھ نگل رہا ہے ، مجھے کچھ گھونٹ رہا ہے ! ویرانوں میں سے چیخیں آرہی ہیں ! دیواروں میں سرگوشیاں ہیں ! ہوا میں کچھ لرز رہا ہے ! (یک لخت کانپ اٹھتا ہے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے) کیا ہے ؟ میں کہاں ہوں ؟ (اکبر کو دیکھ کر) تم کون ہو ؟ ظل الٰہی ! (اٹھ کر دو زانو ہو جاتا ہے ۔) تم شہنشاہ ہو ، سخی ہو ، رحیم ہو ، مجھے ایک خنجر لادو ۔ میں اس کے بعد بھی تم کو باپ کہوں گا ۔ تمھارے قدموں میں سر رکھ دوں گا ۔ تمارے ہاتھ چوم لوں گا ۔ مجھے للہ ایک خنجر لا دو ۔

اکبر : (آنکھوں میں آنسو امنڈ آتے ہیں ۔) خداوندا ! کیا معلوم تھا ، یوں ہوگا ! شیخو میرے مظلوم بچے ، میرے مجنوں بچے ، اپنے باپ کے سینے سے چمٹ جا ۔ اگر ظالم باپ سے دنیا میں ایک راحت بھی پہنچی ہے ، تیرے سر پر اس کا ایک احسان بھی باقی ہے تو میرے بچے میرے سینے سے چمٹ جا ۔ میں شعلوں میں بھن رہا ہوں ، میرے سینے سے چمٹ جا اور تو بھی آنسو بہا ، میں بھی آنسو بہاؤں گا ۔

(اکبر ہاتھ پھیلاتا ہے - سلیم کھڑا ہو جاتا ہے اور ذرا دیر باپ کو دیکھتا رہتا ہے -)

مان جاؤ شیخو، مان جاؤ -

(سلیم منہ موڑ لیتا ہے اور ہاتھ پیشانی پر رکھ کر خاموش مسند پر بیٹھ جاتا ہے - اکبر کے ہاتھ مایوسی سے گر پڑتے ہیں -)

مجھے چھو مت - ایک دفعہ باپ کہہ دے، صرف ابا کہہ کر پکار لے - (آنسو اور زیادہ امنڈ آتے ہیں -) میں تجھے خنجر لا دوں گا، ہاں خنجر تک لا دوں گا مگر بیٹا یہ بد نصیب باپ جسے سب شہنشاہ کہتے ہیں اپنا سینہ ننگا کر دے گا، خنجر اس کے سینے میں بھونک دینا - پھر تو دیکھے گا اور دنیا بھی دیکھے گی کہ اکبر باہر سے کیا ہے اور اندر سے کیا ہے - اکبر کا قہر، اکبر کا ستم اور اکبر کا ظلم کیوں ہے - اس کے خون میں بادشاہ کا ایک قطرہ نہیں، ایک بوند نہیں - وہ سب کا سب شیخو کا باپ ہے، صرف باپ - وہ بادشاہ ہے تو تیرے لیے، وہ مزدور ہے تو تیرے لیے، وہ قاہر اور جابر بھی ہے تو تیرے لیے، وہ تیرا غلام ہے اور میرے جگر گوشے، غلاموں سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں -

(اکبر سسکیاں بھرتا ہوا منہ موڑ لیتا ہے اور ضبط کی کوشش کرتا ہے -)

(رانی گھبرائی ہوئی حرم کے دروازے سے داخل ہوتی ہے - جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر اندر آتی اور مسند پر بیٹھ کر سلیم کو آغوش میں لے لیتی ہے - سلیم سامنے ہوا میں بے معنی نظروں سے تک رہا ہے -)

رانی : میرا سلیم، میرا سلیم - لٹا ہوا بچہ، زخمی جگر کا

ٹکڑا میرا نامراد شہزادہ — (آگے جھک کر) کہاں دیکھ رہا ہے چندا! ہوا میں کیا ہے؟

سلیم : (آہستہ سے) وہ راستہ تک رہی ہے، ہاں راستہ تک رہی ہے۔ اس کے فق چہرے پر فریاد ہے۔ دھندلی آنکھوں میں انتظار ہے، نیلے ہونٹ پر سلیم ہے، (بیتاب ہوکر) مجھے وہاں بھیج دو۔ میری کوئی ماں ہے تو بھیج دے۔ میرا کوئی باپ ہے تو بھیج دے۔ اس محل میں کوئی انسان ہے تو بھیج دے۔ بد نصیب روح کا، معصوم انارکلی کا صبر نہ لو، اجڑ جاؤ گے۔ اس محل میں وہ ناشاد روح سائیں سائیں کرے گی۔ دیواروں میں پناہ نہ ہوگی۔ قبر میں پناہ نہ ہوگی۔ آسمان تک میں پناہ نہ ہوگی۔

رانی : (آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے) دیکھ لیا، مہابلی دیکھ لیا۔ تمھارے سینے میں ٹھنڈک پڑگئی۔ جاؤ اپنے تخت پر جاؤ، حکومت کرو۔ فتحیں پاؤ، اولاد کو برباد کرلیا، ماؤں کو خون رلا دیا اور کیا چاہتے ہو۔ (اکبر آنسو پونچھتا ہوا بھاری قدموں سے سیڑھیوں کی طرف جاتا ہے)

سلیم : (ماں سے لپٹ کر روتے ہوئے) اماں انارکلی! اماں انارکلی!

رانی : (سلیم کو لپٹا کر اور اپنا رخسار اس کے سر پر رکھ کر) میرے لال وہ زندہ رہے گی، وقت کی گود میں، زمانہ کی آغوش میں۔ یہ لاہور اس کا نام زندہ رکھے گا۔ دنیا اس کی داستان سلامت رکھے

گی - اور تو بھی ، میں بھی اور دور دراز کی نسلیں بھی اس پر آنسو بہائیں گی - سن رہا ہے چاند!
(سلیم ماں کے سینے سے سر لگائے رو رہا ہے - ماں اس کے سر پر شفقت مادری کا سکوں ریز ہاتھ پھیر رہی ہے - )

(اکبر دل شکستہ اور آنسو بہاتا ہوا یوں سیڑھیاں چڑھ رہا ہے گویا اس کے اوپر نامرادی اور غم نصیبی کا ویرانہ ہے اور اس نے اپنے لیے اسی کو پسند کر لیا ہے )

(ماخوذ از انارکلی)

# اوپندر ناتھ اشک

اوپندر ناتھ اشک نفسیاتی افسانے لکھتے ہیں۔ ان کے بیشتر پلاٹ نفسیاتی حقائق پر مبنی ہوتے ہیں اور معاشرہ میں جو نشیب و فراز، عدم مساوات پائے جاتے ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں معاشرہ میں رسم و رواج کی بندش بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس معاشرہ میں عورتوں کا مستقبل ایسے لوگ طے کرتے ہیں جو نفسیاتی حیثیت سے ان کے کردار اور رجحان کو نہ تو سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس تنگ نظری کو جب تک دور نہ کیا جائے گا قوم اور ملک صحیح راستے پر کامیابی کے ساتھ گامزن نہیں ہو سکتے۔

# قیدِ حیات

## افراد

| | |
|---|---|
| احسان | ریاض |
| سلطان | سرور |
| عقیل | نعیم |

ذکیہ ، نجمہ ، رحیمن ، بیگاں ، نسو اور مجی

## مقام

جموں سے اٹھارہ میل دور اکھنور کے قصبہ میں ذکیہ کا گھر۔

## وقت

صبح سے شام تک

( ذکیہ کا گھر اکھنور کے قدیم قصبہ میں دریائے چناب کے کنارے ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ چوں کہ اکھنور کا قصبہ جموں ( کشمیر ) سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر ہمالیہ کی ترائی میں واقع ہے اور ذکیہ کا گھر اس قصبہ میں سب سے اچھی جگہ بنا ہوا ہے ، اس لیے اس کی کھڑکیوں سے دریا اور پہاڑوں کے نہایت دلچسپ اور دلفریب مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

پردہ اسی گھر کے سونے کے کمرے میں اٹھتا ہے اور پہلی

نظر میں کمرے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ، کیوں کہ باہر سے گھر کی شان کو دیکھ کر کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ اندر سے اتنا بد زیب ہوگا ۔

لیکن قصور شاید مکان بنانے والے کا نہیں ، کیوں کہ یہ کمرہ بھی کافی کشادہ ہے اور پرانی وضع کا ہونے کے باوجود کافی ہوا دار اور روشن ہے ۔ سامنے کی دیوار میں تین دروازے ہیں جو آنگن کی بالکونی پر کھلتے ہیں ۔ ان دروازوں میں سے بالکونی کا جنگلہ ، اس سے پرے نیلا آسمان ، وشنو دیوی کی تینوں چوٹیاں اور ہمالیہ کے برفانی پہاڑ نظر آتے ہیں ۔ اس بالکونی سے ایک طرف باورچی خانہ اور سیڑھیوں کے دوسری طرف غسل خانہ اور دوسرے کمروں کو راستہ جاتا ہے ۔ ادھر سے آنے جانے والے ان تینوں دروازوں سے نظر آجاتے ہیں ۔ بائیں دیوار میں دو کھڑکیاں اور ان کے درمیان ایک الماری بنی ہوئی ہے ۔ یہ کھڑکیاں دریا کی طرف کھلتی ہیں ۔ ان سے نہ صرف دریا کا نظارہ کیا جاسکتا ہے بلکہ ہر وقت ٹھنڈی ہوا کا لطف بھی اٹھایا جاسکتا ہے ۔ دائیں دیوار کے پرلے کونے میں ایک دروازہ ہے جو دوسرے کمرے کو جاتا ہے ۔ اس کے ورے کو دیوار میں ذرا اونچے دو بڑے بڑے طاق بنے ہوئے ہیں ۔ ان ہی طاقوں کے نیچے ذکیہ کا پلنگ لگا ہوا ہے ۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے درمیان دیواروں میں کھونٹیاں بھی لگی ہوئی ہیں ۔ لیکن ان دروازوں ، کھڑکیوں اور کھونٹیوں کے باوجود کمرہ تنگ اور تاریک نظر آتا ہے ۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت کھڑکیاں اور سامنے کی بالکونی پر کھلنے والے دو دروازے بند ہیں ۔ درمیان کا بھی آدھا کھلا ہے ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کھونٹیوں ، اور طاقوں الماری کے باوجود اتنی چیزیں ایک ساتھ کمرے میں

گڈمڈ پڑی ہیں کہ کمرے کی وسعت اس بے ترتیبی میں گم ہو کر رہ گئی ہے - معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کمرہ سونے کا ہے ، کھانا کھانے یا نہانے کا - بالکونی پر کھلنے والے بائیں طرف کے دروازے کے نزدیک موری ہے اور چھوٹا سا کھرا بنا ہوا ہے - اس کھرے کے برابر لوٹے اور بالٹیاں پڑی ہوئی ہیں - ادھر کو بائیں دیوار کے ساتھ الماری کے برابر چرخہ اور کاتنے ٹیرنے کا دوسرا سامان پڑا ہے - الماری کے پٹ کسی بے شرم کی بیباک آنکھوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں - اور اس کے خانے ڈائلٹ سے لے کر سینے پرونے کے سامان تک بے شمار چیزوں سے اٹے پڑے ہیں - ان سب پر مٹی کی ایک ہلکی سی تہہ جمی ہوئی ہے - کونے میں موری کے اوپر چھت کے ساتھ ٹنگنا ہے جس پر رضائیاں اور دلائیاں بے ترتیبی سے ایک دوسری کے اوپر ٹنگی ہوئی ہیں - کھونٹیاں اور طاق بھی اسی طرح مختلف چیزوں سے اٹے پڑے ہیں - ذکیہ کے پلنگ کی بائیں طرف کو کمرے کے درمیان ایک اور چارپائی بچھی ہوئی ہے جس کا بستر آدھا آلٹ دیا گیا ہے - ذکیہ کے اپنے پلنگ پر بستر تکیہ اور چادریں ریشمی ہونے کے باوجود گندی اور میلی کچیلی ہیں - چارپائیوں کے علاوہ جو فرش خالی ہے اس میں تپائی اور چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی ہیں - فرش پر بچوں کے کھلونے بکھرے ہوئے ہیں - اس سب بے ترتیبی نے کمرے کو اور بھی تنگ کر دیا ہے -

اگرچہ دن کے دس بج چکے ہیں اور کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باوجود کمرہ خاصا روشن ہے لیکن ذکیہ ابھی تک اپنے پلنگ پر پڑی کروٹیں بدل رہی ہے -

پردہ اٹھنے کے کچھ لمحے بعد بائیں طرف کے بند دروازے

کو پٹاخ سے کھولتے ہوئے نسو اور مجی بے تحاشا ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آتے ہیں - دروازہ کھلنے کی آواز سے ذکیہ چونکتی ہے لیکن اٹھتی نہیں ، کروٹ بدل کر لیٹی رہتی ہے -

نسو اور مجی میں ایک ڈیڑھ سال کا فرق ہے - مجی سات برس کا ہے اور نسو چھ برس کی - ایکن دونوں ہم عمر دکھائی دیتے ہیں - دونوں کے کپڑے میلے اور چہرے ناصاف ہیں - نسو کے ہاتھ میں ایک گیند ہے جسے سینے سے لگائے وہ مجی کے آگے آگے بھاگی آتی ہے -

مجی : میرا گیند ... میرا گیند -

نسو : کیوں ، ہم نہ کھیلیں گے -

مجی : تم کیوں کھیلو گی - میں تمہاری گڑیوں سے کھیلتا ہوں -

( زبردستی گیند چھین لیتا ہے - )

نسو : میرا گیند .... دے میرا گیند .....

( مجید کو پیٹتی ہے - )

مجی : ( برابر پیٹتا ہوا ) لے یہ لے .... یہ لے .... پھر پیٹے گی ؟

( نسو روتی ہے )

ذکیہ : ( صرف کروٹ بدل کر ) ارے کوئی ہے ؟ ان کمبختوں کو نکالے میرے کمرے سے ، پل بھر کا چین حرام ہو گیا ، ان بدذاتوں کے مارے - خدا ایسی اولاد دشمن کو بھی نہ دے -

( احسان صاحب داخل ہوتے ہیں - دوہرے جسم کے بھاری بھرکم آدمی ہیں - لیکن انہیں مضبوط اور توانا

نہیں کہا جاسکتا ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے جسم نے بے دل ہوکر گوشت چھوڑ دیا ہے ۔ ان کی چال میں ایک عجیب طرح کا اضمحلال ہے ۔ کپڑے بھی صاف نہیں ۔ معلوم ہوتا ہے ، جیسے ان کا وجود بھی اس کمرے کا ایک حصہ ہے ۔ ان پر بھی وہی بے دلی اور بے حسی طاری ہے جو کمرے پر )

احسان: (بچوں کو دبے لہجے میں سرزنش کرتے ہوئے) جاؤ بیٹا ، بھاگو ۔ اُدھر جا کر کھیلو! (نزدیک آ کر) ، ارے بھئی ابھی تک لیٹی ہوئی ہو ۔ پھر طبیعت کچھ خراب ہے آج ؟

ذکیہ : ( اسی تھکی تھکی آواز میں ) یونہی سر میں ہلکا ہلکا درد تھا ۔ جسم ٹوٹ سا رہا تھا ( احسان آکر اس کے قریب بیٹھ جاتے ہیں ۔ اس کے بکھرے ہوئے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہیں)

احسان: (لمبے سانس کو دباتے ہوئے) وہ دن کتنی خوشی کا ہوگا ذکیہ ، جب میں تمہیں تندرست دیکھوں گا ۔ پیٹ درد ، کمر درد ، کوئی درد لگا ہی رہتا ہے تمہیں ۔

ذکیہ : اب بیماری پر انسان کا کیا زور ہے ۔

احسان: لیکن جہاں بیماری ہے وہاں علاج بھی تو ہے ۔ تمہاری بیماری کا تو کوئی علاج ہی نہیں ۔ کاش تمہارے درد کی دوا میرے بس میں ہوتی !

ذکیہ : آپ ۔ ۔ ۔ ۔ لو بھلا ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔ ۔ (اٹھنے کی کوشش کرتی ہے ، لیکن لیٹی رہتی ہے)

احسان: (لمبا سانس بھرتے ہیں) کاش میں تمہیں خوش رکھ سکتا!

ذکیہ : بھلا مجھے کیا غم ہے ۔ میں ہر طرح خوش ہوں ۔

احسان: خوش ہو ! (زور سے ہنستا ہے) خوشی کی کوئی علامت تو تمہارے چہرے پر دکھائی نہیں دیتی ۔ مجھے ساون کی وہ شام یاد ہے جب میں رضیہ کی موت کے بعد دلی گیا تھا ۔ تم ہی نے قطب صاحب چلنے کی تجویز کی تھی ۔ میں ، نکہت ، تم اور ریاض چاروں قطب دیکھنے گئے تھے ۔ کتنی خوش تھیں تم اُن دنوں ۔ کتنی شوخ اور چنچل ، کتنا ہنسا کرتی تھیں (لمبا سانس بھرتا ہے) یہاں آکر نہ جانے کیا ہو گیا !

(ذکیہ چپ رہتی ہے)

احسان: اور میں سوچتا تھا یہاں آکر تمہاری محبت میں اضافہ ہوگا ۔ یہ خوب صورت فضا ، یہ ہوا ، یہ پہاڑ ، یہ دریا ۔ صبح و شام ہم سیر کو جایا کریں گے ۔

ذکیہ : آپ جاتے ہی نہیں ۔ میں کتنی بار کہہ چکی ہوں ۔

احسان: میں نہیں جاتا ! (طنز سے ہنستے ہوئے کمرے میں گھومتے ہیں ۔) میں سیر کو جایا کرتا تھا ، جب تمہاری بہن زندہ تھی ۔

ذکیہ : (کروٹ بدل کر) آپ اب بھی جاسکتے ہیں مگر آپ کو فرصت بھی ملے ۔

احسان: فرصت (اسی طنز سے ہنستے ہیں) تمہارے آنے کے بعد تمہیں شاید یاد بھی نہیں ۔ میں نے تمہارے ساتھ صبح صبح سیر کو جانے کی کوشش کی تھی ۔ سورج نکلنے سے کہیں پہلے دریا کے نیلگوں پانی میں سونا مل جاتا ، کنول کے پیلے پیلے پتوں سے دائرے دریا کی لہروں میں بنتے مٹتے جاتے ۔ ادھر سورج کی

پہلی کرن جھانکتی ادھر اس زردی میں سرخی تحلیل ہونے لگتی - (کھڑکی میں جا کر کھڑے ہوتے ہیں-) صبح کی اس پاکیزہ کنواری فضا میں میرا دل ایک عجیب مسرت سے معمور ہو جاتا - یوں محسوس ہوتا جیسے دنیا نے پہلی بار نہ جانے کتنی لمبی نیند کے بعد آنکھیں کھولی ہیں (ذکیہ کی طرف مڑ کر) لیکن میں غلطی پر تھا - دو نہیں ، اس خوب صورتی کا نظارہ کرنے والا تو میں صرف اکیلا ہوتا - تم تو نہ جانے کہاں ہوتی تھیں - گم سم سی بیٹھی نہ جانے ماضی کا کون سا خواب دیکھا کرتی تھیں - پھر میں سیر چھوڑ کر مصروف رہنے کی کوشش کیوں نہ کرتا -

ذکیہ : مجھے میرے حال پر چھوڑیے ، آپ جایا کیجیے ، مجی اور نسو کو لے جایا کیجیے -

احسان: مجی اور نسو ! (زور سے ہنستے ہیں) اب تو کبھی سیر کو جانے کی خواہش ہی نہیں ہوتی - ایک عجیب طرح کی بے حسی طاری رہتی ہے - زندگی سردیوں کے اسی چناب کی طرح اپنی جوانی کھو چکی ہے - کیا سوکھا سمٹا کھویا کھویا سا بے آواز بہہ رہا ہے ، نہ جانے اس کو اپنی جوانی کی یاد آتی ہے یا نہیں ؟ (واپس ذکیہ کی چارپائی کی طرف آتے ہوئے) میں تو قریب قریب بھول ہی گیا ہوں ، یہ تو ریاض کے آنے کی خبر سن کر کچھ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں - (لمبا سانس لے کر برابر کی چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں - ذکیہ اچانک چونک کر اٹھتی ہے) -

ذکیہ: ریاض! کون ریاض؟ ریاض بھائی، کیا یہاں آئے ہیں؟

احسان: سنا ہے جموں آئے ہیں۔

ذکیہ: (چارپائی چھوڑ کر ان کے قریب آجاتی ہے) جموں؟ کیوں آپ کو کیسے پتا چلا؟

احسان: (اس کی بات کا جواب دیے بغیر اپنے جذبات کی رو میں) میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں ذکیہ۔ پچھلے آٹھ برس میں، میں برابر سوچتا چلا آیا ہوں، اگر میں تمھاری بہن کی موت کے بعد دلی نہ گیا ہوتا تو تمھاری ہنسی خوشی کا سوتا بھی یوں نہ سوکھ جاتا اور میری زندگی کی پہاڑی بھی یوں دھندلاہٹوں کی گود میں نہ جا سوتی۔

ذکیہ: رضیہ آپا اتنی اچھی تھیں، ان کی جدائی کیسے محسوس نہیں ہوتی؟ میں پوچھتی تھی کہ ریا......

احسان: اور خالہ نے کہا تھا، ذکیہ رضیہ کے غم کو تمھارے دل سے بھلا دے گی۔ اگر خالہ میرا حوصلہ نہ بڑھاتیں تو شاید کبھی تمھیں مانگنے کی جرأت بھی نہ کرسکتا۔

ذکیہ: (دوسری چارپائی کا بستر اکٹھا کرنے لگتی ہے) یہ آج آپ کیا گڑے مردے اکھیڑنے لگے ہیں۔ آٹھ برس ہوگئے ہماری شادی کو، اچھی بھلی بسر ہو رہی ہے۔ میں اگر بیمار نہ ہو جاتی ــــ (بستر اپنی چارپائی پر رکھ کر چارپائی اٹھانا چاہتی ہے۔ احسان صاحب اس کی چارپائی پر جا بیٹھتے ہیں۔)

احسان: تم کبھی بیمار نہ رہتیں، اگر تم یہاں نہ آتیں۔ آج

ریاض کے جموں آنے کی خبر سن کر میرے سامنے قطب کی وہی شام اور اس شام کی وہی ذکیہ گھوم گئی ہے۔

ذکیہ : (چارپائی اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے) یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ چھوڑیے بھی اس قصے کو، دیکھیے میں اٹھ تو بیٹھی ہوں۔ طبیعت خراب تھی، نہیں تو مجھے کیا لطف آتا ہے، دن دن بھر لیٹے رہنے میں۔ میں ریاض کی بابت پوچھ رہی تھی اور آپ .....

(تنکتی ہوئی الماری ٹھیک کرنے چلی جاتی ہے۔)

احسان : اب تم تو یونہی ناراض ہوتی ہو، میں نے کبھی کچھ کہا ہے۔ میری طرف سے آٹھوں پہر لیٹی رہو۔ ریاض کے آنے کی خبر سن کر یونہی خیال آگیا کہ جموں آیا ہے تو ہوسکتا ہے یہاں بھی چلا آئے۔

ذکیہ : (الماری صاف کرنا چھوڑ کر واپس آتے ہوئے) یہی تو پوچھ رہی ہوں پہر بھر سے اور آپ ہیں کہ بات کا جواب ہی نہیں دیتے۔

(پھر واپس الماری کی طرف جاتی ہے)

احسان: (اس کے پیچھے جاتے ہوئے) یہی تو بتانے آیا تھا لیکن نہ جانے کیوں تمھیں بیمار اور پژمردہ دیکھ کر مجھے افسوس سا ہونے لگتا ہے۔

ذکیہ : اب تو میں اٹھ بیٹھی ہوں۔ کام بھی کرنے لگی ہوں۔ طبیعت جب ٹھیک نہ ہو تو.....، کیا کرنے آئے ہیں ریاض بھائی جموں؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا اُن کے آنے کا؟

احسان: رات قسیم آیا ہے وہاں سے، کہہ رہا تھا کہ ریاض میاں جموں آئے ہوئے ہیں، ان کے تو خوب چرچے ہیں وہاں۔ پرسوں ان کے اعزاز میں پارٹی ہوئی، مشاعرہ بھی ہوا۔ اور وہ کہتا ہے جموں کے تینوں مقامی اخباروں میں ان کا تذکرہ ہے۔

(ذیل کے مکالمے میں ذکیہ نادانستہ طور پر کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں کو ترتیب سے رکھنے لگتی ہے۔ جوں جوں وہ ریاض کا ذکر کرتی ہے اس کی بے حسی دور ہوتی جاتی ہے اور ترتیب کے کام کی رفتار بڑھتی جاتی ہے۔)

ذکیہ: کتنی عزت حاصل کی ہے ریاض نے اور خالو ہمیشہ کوسا کرتے تھے کہ خاندان کے نام کو داغ لگائے گا۔

احسان: آوارہ جو تھے بچپن میں۔

ذکیہ: نہیں آوارہ تو کیا تھے، الٹے آٹھوں پہر گھر میں پڑے رہتے تھے لیکن درسی کتابوں سے انہیں چڑ تھی۔

احسان: تو پھر پڑھتے کیا تھے؟

ذکیہ: پریوں اور دیوؤں کے قصے کہانیاں اور کیا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے خرید لاتے۔ خالو کو چڑ تھی ان سب کتابوں سے۔ وہ انہیں مخرب الاخلاق سمجھتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے بھائی ریاض کے دشمنوں کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ خالو انہیں دیکھنے گئے تو الف لیلہ پڑھ رہے تھے۔ خون ہی تو اتر آیا ان کی آنکھوں میں، باہر سے تو آئے ہی تھے، چھڑی ہاتھ میں تھی، دھڑا دھڑ پیٹنے لگے۔

احسان: بڑے جابر تھے تمہارے خالو!

ذکیہ : اگر یہ معافی مانگ لیتے تو ان کا غصہ فرو ہو جاتا ، دودھ کا ابال ہی تو ہوتا تھا ان کا غصہ ، آیا اور اتر گیا لیکن ریاض بھائی تو گویا پتھر کے تھے ، ٹس سے مس نہ ہوئے ۔ آنکھوں میں آنسو تک نہ آئے ۔ جھلا کر خالو جان نے کان سے پکڑ کر باہر کر دیا ۔

احسان : خالہ نے نہیں روکا ۔

ذکیہ : خالو جان غصے میں ہوں تو کس کا حوصلہ تھا کہ ان کے سامنے دم بھی مارے لیکن ریاض بھائی بھی نہ جانے کس مٹی کے بنے تھے نہ روئے نہ چلائے ، جا کر نیم تلے بیٹھ گئے ۔ جب رات کے بارہ بجے خالو جان باہر سے لوٹے تو انھیں کان سے پکڑے ساتھ لیتے آئے ۔ لا کر بستر پر پٹک دیا اور بولے ، یہ کمبخت خاندان کے نام کو داغ لگائے گا ۔ خدا کی شان دیکھو وہی خاندان کے نام کو روشن کر رہے ہیں ۔

احسان : بڑا نام حاصل کیا ہے ریاض میاں نے ۔

ذکیہ : لیکن چھوڑ تھوڑی دیا تھا ان حضرت نے ان قصوں کا پڑھنا ۔ پڑھتے رہے اور بیچ کھیت پڑھتے رہے ۔ ایک بار خالہ نے امی جان سے ریاض کو اپنی غلامی میں لینے کے لیے کہا ۔

احسان : (ہنس کر) خالہ کی نظر تھی تم پر ۔

ذکیہ : امی تو شاید تیار بھی ہو جاتیں لیکن خالو یہ سنتے ہی آگ بگولا ہوگئے ۔ مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے ۔ کیوں اس غریب لڑکی کا گلا کاٹنے کے درپے ہو ۔ جو آدمی چار پیسے نہیں کما سکتا ، وہ بیوی کی ناز برداری کیا

گرسکتا ہے اور ابا جان خالو سے متفق تھے ۔

احسان: (ذرا ہنس کر) تمھارا کیا خیال تھا ؟

ذکیہ: میرا .... لو بھلا میں ..... بڑی اچھی ہوں جیسی ہوں ۔

احسان: لیکن شادی تو پھر شاید ریاض نے نہیں کی ۔

ذکیہ: خالہ تو کئی جگہ بات پکی کر آئیں لیکن پہلے خالو جان کی رائے میں ان کے طور نہ بدلے اور پھر جب طور بدلے تو سنتی ہوں ریاض بھائی نے شادی سے ہی انکار کردیا اور پھر (لمبا سانس بھر کر) خالہ اور خالو دونوں اللہ کو پیارے ہوئے ۔

احسان: لیکن وہ کسی نجمہ کے متعلق ........ کچھ بھنک ..... کان میں پڑی تھی ۔

ذکیہ: ایک نجمہ کیا بیسیوں نجمہ ان کے قدموں پر نثار ہونے کے لیے تیار ہیں ۔ وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں بھی ۔ نکہت آتی تھی تو شکایت کرتی تھی کہ وہی رنگ ڈھنگ ہیں بھائی جان کے ۔ عام لوگوں کی طرح رہتے ہی نہیں ، بس شعر و نغمہ کی خیالی دنیا میں بستے ہیں ........ اب جموں کیا کرنے آئے ہیں ۔

احسان: ہوسکتا ہے کہ کسی مشاعرے آشاعرے میں آئے ہوں ۔

ذکیہ: جموں آگئے لیکن یہاں نہیں آئے ۔

احسان: وہ مصروف آدمی ہیں ۔ ان کا پل پل بندھا ہوگا ۔

ذکیہ: ہاں مصروف آدمی ہیں !

احسان: ابھی تو میں کہنے آیا تھا کہ آ نہ جائیں یہاں ! جب جموں آئے ہیں تو یہاں بھی آ سکتے ہیں اور گھر میں اتنی بے ترتیبی پھیلی ہوئی ہے ۔

ذکیہ: (امید و بیم کے ملے جلے جذبات سے) ہاں آگئے ...... اس آٹھ برس کے عرصہ میں کتنی بار لکھا ۔ نزہت، نکہت، ارشد سب کے ہاتھ کہلا بھیجا ۔ خطوں کی تو کبھی رسید نہیں دی ، اب آئیں گے ۔
(رحیمن دروازے سے جھانکتی ہے)

رحیمن: سرکار ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں ۔ سلطان انہیں دفتر میں بٹھا آیا ہے ۔

احسان: میں جاتا ہوں ۔ تم ذرا یہ جگہ صاف کر دو رحیمن ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی یہاں بھوت ناچ کر گئے ہیں۔ تم لوگ کرتے کیا رہتے ہو سارا دن ؟ جانتی ہو کہ بیگم کی طبیعت خراب رہتی ہے (جاتے جاتے زمین پر پڑی ہوئی ایک دو چیزوں کو ٹھوکر مارتے ہیں ۔) اٹھاؤ یہ سب کوڑا کرکٹ اور صاف کرو اس کمرے کو! (چلے جاتے ہیں لیکن استہزا آمیز ہنسی کے ساتھ کہے ہوئے ان کے الفاظ برابر کان میں پڑتے ہیں) ۔ میں یہاں کا رینجر ہوں ۔ میرے تین تین ملازم ہیں اور میرے گھر کی یہ حالت ہے ۔
(رحیمن ذکیہ کے ساتھ کمرہ صاف کرنے میں مدد دیتی ہے ۔ کچھ لمحے بعد مجی ہنستا ہوا بھاگتا آتا ہے ۔ نسو چیختی چلاتی اس کے پیچھے بھاگتی داخل ہوتی ہے ۔)

نسو: دے میری گڑیا ، دے میری گڑیا ۔ (اسے پکڑ کر پیٹتے

ہوئے ) دے میری گڑیا دے .... دے۔

مجی : ( برابر سے اسے پیٹتا ہوا ) پھر مارے گی مجھے ، لے ... یہ لے ........ یہ لے ......

ذکیہ : ( کام چھوڑ کر ) ایں ہیں نسو ۔ مجی یہ کیا ہو رہا ہے ۔

نسو : ( سسکتے ہوئے ) گڑیا چھین لی میری ۔

مجی : پھر مجھے چڑاتی کیوں تھی ؟

ذکیہ : چڑاتی تھی تو پھر کیا ہوا ۔ تیری چھوٹی بہن ہے ۔ اچھے لڑکے اپنی چھوٹی بہنوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہوں گے ۔ تیرے ماموں جان ہمیشہ پیار کرتے تھے ، کبھی نہ پیٹتے تھے ۔

نسو : (سسکنا کچھ کم کر کے) نسیم ماموں جان امی !

ذکیہ : وہ تو اسی مجی کی طرح تھے ۔ میں تمھارے ریاض ماموں جان کا ذکر کر رہی ہوں ۔

نسو : (سسکنا اور بھی کم کر کے) بڑے امیر آدمی ہیں ۔

ذکیہ : نہیں بیٹی ان کا نام بڑا ہے ، وہ شاعر ہیں ، ملک بھر میں ان کی عزت ہے ۔ جہاں وہ جاتے ہیں ، لوگ ان کے راستے میں آنکھیں بچھاتے ہیں ۔ ابھی تمھارے ابا کہہ رہے تھے کہ وہ جموں آئے ہوئے ہیں ۔ (مجید سے) اگر وہ تمھیں دیکھ لیں مجی تو کیا کہیں ؟ شکل تو دیکھو کیسی بھنگیوں سی بنا رکھی ہے ۔ (رحیمن سے) رحیمن یہ کمرہ پھر صاف کرنا ، پہلے اسے لے جا کر نہلا اور اس کے کپڑے بدل ۔ یہ بالٹیاں اور لوٹے لے جا یہاں سے ۔

مجی : (اماں کے اس اچانک جاگ اٹھنے والے پیار سے فائدہ اٹھا کر منمناتا ہوا) امی - می - می -

ذکیہ: (ڈانٹ کر) جا بھی کمبخت ! (پھر سنبھل کر) جا بیٹا تیرے ماموں جان آئیں گے تو تجھے اس طرح میلے کپڑے پہنے دیکھ کر ناراض ہوں گے اور مٹھائی نہ دیں گے۔ جا ، جا ، میرا راجا بیٹا !

مجی : پھر میں دو پیسے کی برفی لوں گا ۔

ذکیہ: (دانت پیستے ہوئے لیکن پیار سے) ہاں ہاں لے لینا برفی -

رحیمن: چلو - چلو -

(رحیمن مجید کو لے جاتی ہے اور ذکیہ نسیمہ کو گود میں لے کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے - )

ذکیہ: (بڑے پیار سے) اور کیوں نسو بیٹا اس طرح بڑے بھائیوں سے پیش آتے ہیں !

(اماں کے اس غیر متوقع سلوک سے چونک کر نسیمہ چپ رہتی ہے - )

کہو بیٹا -

نسو : چھینی کیوں اس نے میری گڑیا ؟

ذکیہ : گڑیا چھین لی تھی تو مجھ سے کہتی - یہ کیا کہ ڈھول ڈھپا شروع کر دیا - یہ تو چنی کے لچھن ہیں ، منی کبھی ایسا نہیں کرتی -

نسو : (فطری تجسس سے) منی کون تھی امی ؟

ذکیہ: منی چنی کی چھوٹی بہن تھی ، کہنے کو وہ ننھی منی

تھی لیکن بڑی بہن کے مقابلے میں اتنی ہوشیار، سمجھ دار اور نیک کہ سب اس سے پیار کرتے تھے - چنی دن چڑھے تک سوتی رہتی اور جب اٹھتی تو بہن بھائیوں سے لڑتی، لیکن منی بہن بھائیوں سے پیار کرتی اور اماں ابا کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی - گھر تو گھر محلہ بھر اس سے پیار کرتا تھا ...... اب میری نسو بیٹی چنی بنے گی یا منی ؟

نسو : ( ماں کی گود میں اچھل کر ) میں تو منی بنوں گی -

ذکیہ : لے پھر اپنی گڑیا کے جوڑے اور کھلونے سنبھال کر رکھ دے - تیری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں اور دیکھ تو کمرے کو کس طرح گندہ کر دیتی ہے -

( نسو کو پیار سے چوم لیتی ہے - )

نسو : ( محجوب ہو کر ) ابھی اٹھا لیتی ہوں -

ذکیہ : ( نسو کو ایک بار پھر پیار سے چوم کر ) بڑی اچھی ہے میری منی بیٹی -

سلطان: ( باہر سے ) دلہن بیگم ! سرکار نے کہلا بھیجا ہے کہ ریاض میاں جموں سے آئے ہیں -

ذکیہ : ( بیٹی کو پیار کرنا بھول کر اسے فوراً گود سے اتارتے ہوئے ) ریاض بھائی آگئے .... رحیمن ! ( اور بھی زور سے ) رحیمن -

رحیمن: ( غسل خانے سے ) جی بیگم آئی ( گیلے ہاتھ لیے بھاگی آتی ہے ) جی -

ذکیہ : ( مسرت بھرے جوش سے ) دیکھو مجی کو چھوڑو ،

اسے میں نہلاتی ہوں۔ ریاض بھائی آرہے ہیں۔ تم اس کمرے کو فوراً صاف کر ڈالو۔ یہ چارپائی ہٹاؤ۔ جتنی فالتو چیزیں یہاں پڑی ہیں سب اٹھا کر ادھر کمرے میں رکھ دو، میں نئی دری اور چادر نکال دیتی ہوں، تم کمرہ جھاڑ کر پلنگ پر نیا بستر بچھادو... سونے کے لیے نہ جانے کونسی جگہ پسند کریں گے۔

(سوچتی ہے)

رحیمن : بارہ دری اچھی رہے گی۔

ذکیہ : ہاں بارہ دری اچھی رہے گی۔ تم ذرا جلدی جلدی اس کمرے کو صاف کرکے اوپر جاکر بارہ دری کا فرش دھو ڈالو۔ نیچے فرش پر دری دلائی اور جاجم بچھا دینا اور کھڑکی کے برابر میز کرسی لگا دینا۔ میز کے لیے میز پوش اور کرسی کے لیے گدی، میں ابھی دیتی ہوں۔

رحیمن : (اتنا کام سن کر ٹالنے کی غرض سے) لیکن رات بڑی برف پڑی ہے پہاڑوں پر، بارہ‌دری میں سردی نہ ہو۔

ذکیہ : تم بارہ‌دری صاف کرو۔ میں سلطان سے نچلی بیٹھک صاف کرنے کو کہتی ہوں ....... معلوم نہیں وہ کونسی جگہ پسند کریں گے ........ ذرا سلطان کو آواز تو دو۔

رحیمن : (بالکونی کے دروازے پر جاکر سلطان کو آواز دیتی ہے) سلطان ....... سلطان ......

سلطان : (نیچے آنگن سے) کیا بات ہے، چلائے جاتی ہو!

رحیمن : بیگم بلا رہی ہیں۔

سلطان : آیا۔

ذکیہ : (رحیمن کے اُترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھے بغیر بالکونی پر جاتے ہوئے) اور دیکھو بارہ دری کو صاف کرکے ذرا انگنائی کو بھی ٹھیک کر دو۔ یہ جھلنگے جو کمبخت پڑے ہیں انھیں کوٹھڑی میں بند کر دو۔ مرغیوں کو دڑبوں میں ٹھونسو۔ بدبختوں نے جگہ جگہ گڑھے کھود رکھے ہیں۔ (ذرا دھیمی آواز میں) اور دیکھ ریاض بھائی کو پھول بیحد پسند ہیں۔ سلطان کے چھوکرے کو بیگاں کے باغ میں بھیج کر دو گلدستے منگا لو۔ شیشے کے گلاس میں دے دوں گی۔ ایک اوپر بارہ دری میں اور دوسرا نیچے بیٹھک کی میز پر لگا دینا ......... ذرا سی بھی سستی سے کام لیا تو دیکھنا ......!

رحیمن : جی ابھی بھیجتی ہوں۔

ذکیہ : (درمیان کے دروازے میں ذرا پیچھے ہٹ کر) بھائی ریاض آئے ہیں سلطان! اور میں پریشان ہوں کہ ان کے لیے کون سی جگہ اچھی رہے گی، بارہ دری یا بیٹھک؟

سلطان : جی ..... جی۔

ذکیہ : میں نے رحیمن سے بارہ دری صاف کرنے کے لیے کہا ہے، تو ذرا بیٹھک میں جا کر فرش دھو دے۔ تخت

جھاڑ پونچھ کر صاف کر دے اور میز پوش بدل ڈال ۔
بس اب بھاگ جا ۔ تخت کی چادر اور میز پوش بھیج
دوں گی ۔

( سلطان جانے لگتا ہے )

اور سن ! ذرا ان سے جا کر کہنا کہ ریاض بھائی کو
کچھ دیر کے لیے دفتر میں بٹھائیں ، اتنے میں ذرا یہ
صفائی وغیرہ ہو جائے ۔ باہر بلا کر کان میں کہنا ان
کے یہ بات !

سلطان : جی بہتر ۔

ذکیہ : اور دیکھ وہیں نہ بیٹھ رہنا ۔ آکر جلدی سے بیٹھک
صاف کر ۔ میں اتنے میں بچوں کو نہلاتی دھلاتی ہوں ۔
(نسیمہ سے) چل نسو تو بھی نہا کر کپڑے بدل
( رحیمن سے) تو اب تم جاؤ اور جلدی سے یہ کام
نمٹا ڈالو اور ماما کو ساتھ لے لو اور ریاض بھائی کے
آنے تک اس جگہ کو بیٹھنے کے لائق بنا دو ۔
( جاتے جاتے) کنوئیں سے پانی اور بیگان کے باغ سے
پھول منگانا مت بھولنا ۔

( نسیمہ کو ساتھ لے کر چلی جاتی ہے ۔ رحیمن چپ چاپ
کمرے کی صفائی کرنے لگتی ہے ) ۔

(پردہ گرتا ہے)

( ماخوذ از قید حیات )

# صالحہ عابد حسین

آپ ڈاکٹر عابد حسین کی رفیقۂ حیات اور خواجہ غلام السیدین کی ہمشیرہ ہیں۔ جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ علمی تھا۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ خواجہ غلام السیدین کی تربیت اور ڈاکٹر عابد حسین کی رفاقت اور خواجہ احمد عباس کی افسانویت سے مانوس ہوئیں۔ دماغ اور دل جب اس طرح مرتب ہوں تو قلم کو جنبش نہ ہونا کیا معنی؟ آپ نے لکھنا شروع کیا اور بہت جلد اپنی سلاست زبان، پاکیزہ خیال اور نسوانی کردار کا سکہ جما لیا۔ اس وقت ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ دہلی میں مقیم ہیں۔

# دست گیر

" نجمہ بیٹی شام ہو گئی - اب تک تیرے ابا جی واپس نہیں آئے - "

" اماں تم نے انہیں جانے کیوں دیا - شہر میں تو قیامت برپا ہے ، ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہے اور ابا جی باہر راشن لینے چلے گئے - "

" بیٹی دو دن تو آدھا تہائی پیٹ کھاتے ہوگئے تھے - آج اگر کرفیو کھلنے کے وقت راشن لینے نہ جاتے تو کل گھر میں بالکل ہی فاقہ ہوتا - "

" بلا سے فاقہ کر لیتے - اب تو ابا جی کی جان کا خوف ہے - اللہ نہ کرے ان کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو . . . . "

" اوئی لڑکی تو تو اور میرے ہاتھ پاؤں پھلائے دیتی ہے - ( ٹھنڈی سانس بھر کر ) آج کو جوان بیٹا زندہ ہوتا تو کاہے کو تیرے بڈھے باپ کو اس ضعیفی میں باہر جانا پڑتا - اس غدر کے زمانے میں جان ہتھیلی پر لے کر گئے ہیں - اللہ حفاظت کرنے والا ہے - "

" الٰہی ابا جی کی جان کی خیر - "

" ستارہ کہاں ہے ؟ "

" شاید اوپر ہے اماں - "

"ستارہ! ستارہ! اوپر بیٹھی کیا کر رہی ہے ؟ نیچے آ ستارہ"

سترہ اٹھارہ سال کی خوب صورت چونچال لڑکی دھم دھم کرتی سیڑھیوں سے اتری اور ماں کے پاس آ کر بولی - "کیا ہے اماں ؟"

"کہاں تھی تو ؟"

"اوپر کھڑکی سے ابا جی کو دیکھ رہی تھی کہ شاید آتے ہوں -"

"اللہ رے تیری دیدہ دلیری - آج کل کوئی کھڑکی کھولتا ہے ؟ نیچے سے کوئی گولی مار دے تو -"

بہن نے میٹھی جھڑکی دے کر کہا -

"اونہہ مجال پڑی ہے کسی کی ، میں نے بھی بہت سے پتھر جمع کر رکھے ہیں - کمبختوں کا مارے پتھروں کے منہ بگاڑ دوں گی -"

ماں نے ڈانٹا "کیا بک بک کر رہی ہے - بیٹی بہت برا وقت پڑا ہے - ہر وقت خدا سے خیر مانگو - میرا تو خون خشک ہوا جاتا ہے - الٰہی تیرے ابا خیر سے واپس آ جائیں - اللہ نہ کرے ، نہ آئے تو اس اکیلے ڈھنڈر گھر میں دو جوان لڑکیوں کے ساتھ ایسے برے زمانہ میں کیسے رہوں گی - مولا میری لڑکیوں کی جان و آبرو اور ان کے باوا کی جان تیری حفاظت میں ہے - میں تیری حقیر ذلیل لونڈی ان پر قربان ہو جاؤں پر ان کی جانیں اور آبرو بچا لیجیو -"

بڑی بی کی دھندلی آنکھوں سے ان کے جھریوں پڑے گالوں

پر آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا ۔ نجمہ نے اپنا سر ماں کے زانو پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ستارہ نے اپنی باہیں ماں کے گلے میں ڈال دیں اور مضبوط لہجے میں بولی ، " میری اماں ، اچھی اماں ، میں تم پر صدقے ، گھبراؤ نہیں ۔ ابا جی انشاء اللہ خیریت سے ہوں گے ۔ اماں دیکھو نا ، کرفیو ذرا دیر کو تو کھلا تھا ۔ سینکڑوں آدمی راشن لینے والے ہوں گے ۔ ابا کو راشن ملنے میں دیر ہوئی ، اتنے میں کرفیو کا وقت ہو گیا ہوگا ، اسی لیے ابا جی نہیں آسکے ۔ وہیں آس پاس کسی جاننے والے کے ہاں ٹھہر گئے ہوں گے ۔ "

" اللہ تیرے منہ کا کہا کرے بیٹی ۔ پر کیا کروں بچی میرا دل تو اندر سے بیٹھا جا رہا ہے ۔ "

" اماں آج یوسف بھائی کے بھی تو آنے کی خبر تھی نا ؟ "

" مولا میرے یوسف کی جان کی خیر ۔ ہے ہے نوج وہ آج کل یہاں آئے ۔ ریلوں میں تو سنتی ہوں خون ہو رہے ہیں ۔ اسٹیشن پر کسی کی جان نہیں بچتی ۔ یا اللہ یوسف کو تو ہی بچانے والا ہے ۔ "

نجمہ کا چہرہ پہلے شرم سے سرخ ہوا اور پھر خوف سے زرد ہو گیا ۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا ، ہاتھ پاؤں میں رعشہ آ گیا ۔ " یا اللہ میرے یوسف کا تو ہی نگہبان ہے " اس نے دل ہی دل میں اپنے منگیتر کے لیے دعا مانگی ۔

اماں ! یوسف بھائی انشاء اللہ بالکل محفوظ ہوں گے ۔ بھلا ایسے حالات میں ان کے ماں باپ نے انہیں گھر سے چلنے ہی کیوں دیا ہوگا ۔ وہ علیگڑھ سے روانہ ہی نہیں ہوئے ہوں گے ۔

تم ذرا فکر نہ کرو۔" ستارہ نے کہا۔ ماں چپ چاپ روتی اور دعا مانگتی رہی۔

ستارہ نے نجمہ کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں " میری آپا تمھیں میری قسم پریشان نہ ہو۔ کہو تو قسم کھالوں کہ یوسف بھائی اپنے گھر پر خیریت سے ہوں گے۔"

نجمہ نے چپ چاپ بہن کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینہ سے لپٹا لیا۔ کچھ بولی نہیں۔ بول ہی نہ سکی۔

مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ ماں وضو کرکے لکڑی کی چوکی پر نماز پڑھنے لگیں۔ ستارہ نے نجمہ سے کہا " آپا سارا دن فاقے سے گزر گیا۔ چلو کچھ پکا لیں۔ بھوک لگی ہے۔"

" بی بی پکانے کو ہے کیا جو پکاؤں ؟"

" نہیں آپا میں نے دیکھا تھا کہ ایک ڈبے میں تھوڑے سے موٹے چاول پڑے ہیں اور کسی ہانڈی میں دو مٹھی دال بھی ہے۔ چلو کھچڑی پکائے لیتے ہیں۔ اماں بھی ذرا سی کھا لیں گی۔"

" جیسی تمھاری مرضی۔ پر میرا تو کسی بات کو جی نہیں چاہتا۔ نہ جانے ابا جی پر کیا بپتا پڑی۔ تارہ مجھے تو ان کی جان کا سخت خطرہ ہے۔"

" میری آپا للہ یہ نہ کہو..... اللہ انہیں بچائے گا۔ انہیں کچھ ہو گیا تو پھر ہمارا کون ہے۔ ہے ہے آج کل تو محلے والے، پڑوسی، عزیز قریب کوئی بھی کسی کی مدد نہیں کرتے...... کر بھی نہیں سکتے۔ قیامت ہے قیامت۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔!"

کوئی گھر میں گھس آیا تو کیا ہوگا - آپا ---- آپا -"

نجمہ : (بہن کو گلے سے لپٹا کر) واہ واہ کہاں تو مجھے اور اماں کو سمجھا رہی تھیں اور کہاں اب خود ایسی باتیں کر رہی ہو بی بی ! سب سے بڑا سہارا ، سب سے بڑا بھروسا تو خدا کا ہے - وہ چاہے گا تو بچالے گا اور اگر مرنا ہی ہے تو خیر مرجائیں گے - ایسے منحوس زمانے میں زندہ رہنے سے مرنا ہزار درجہ بہتر ہے - ان درندوں اور وحشیوں کی دنیا میں زندہ رہ کر کیا کرنا ہے -

ستارہ : (کانپ کر) میں مرنے سے تو نہیں ڈرتی اگر یہ یقین ہو جائے کہ مرہی جائیں گے تو اطمینان ہو جائے ........ پر ہم بدنصیب عورتوں کے لیے موت ہی کا تو ڈر نہیں ، اس سے اور کہیں زیادہ افسوس ناک خطرے بھی تو ہیں- ہے ہے اگر کسی نے پکڑ لیا تو ...."

نجمہ : (لرزتی ہوئی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) تجھے میری قسم تارہ ایسی باتیں نہ کرو ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا ........ چلو چل کر نماز پڑھیں ........ اللہ کے سامنے گڑگڑائیں وہی حفاظت کرنے والا ہے -

ایمان اور عقیدہ سخت سے سخت وقت اور انتہائی مایوسی کی حالت میں انسان کو سہارا دیتا ہے - دونوں بہنوں نے جا کر نماز پڑھی ، دعا مانگی تو دل کو بڑی ڈھارس محسوس ہوئی - باورچی خانہ میں جا کر آگ جلائی کھچڑی چڑھائی اور چپکے چپکے باتیں کرنے لگیں- حال یہ تھا کہ ذرا سی آہٹ اور خفیف سے کھٹکے سے چونک پڑتی تھیں - ستارے کا یہ عالم کہ اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز خود کان میں آرہی تھی - کھچڑی پک چکی تو ایک پلیٹ میں نکالی - کچھ باپ کے خیال سے ہانڈی میں

چھوڑ دی اور اس کو چولھے پر گرم جگہ رکھ دیا اور ماں کے پاس آئیں جو نماز کی چوکی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ سینہ پر سر جھکا ہوا تھا، آنکھوں سے انسو ٹپک ٹپک کر جانماز کو تر کر رہے تھے۔

لڑکیوں نے منت خوشامد کرکے ماں کو راضی کیا کہ چند نوالے کھالیں۔ بڑی بی نے آنکھیں اور منہ پونچھا اور لڑکیوں کی خاطر کھچڑی زہر مار کرنے لگیں۔ دو تین نوالے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

"اوئی کیسی کڑوی کھچڑی ہے ..... خدا خیر کرے ..... میرے تو حلق سے نہیں اترتی۔"

بہنوں نے سہم کر ایک دوسرے کو دیکھا "اماں شاید نمک تیز ہو گیا ...."

"نہیں بیٹی .... یہ بڑی بدشگونی ہے، کھانے کا کڑوا ہونا ..... جانے کیا ہونے والا ہے ...... اوئی اللہ یہ شور کیسا ہے۔"

"ہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلی میں بہت سے آدمی چل رہے ہیں۔"

"کرفیو میں کون گھر سے نکلا ہوگا؟"

"شاید سپاہی پہرہ دیتے پھر رہے ہیں۔"

سب نے ہاتھوں سے نوالے چھوڑ دیے اور غور سے سننے لگیں .... چہرہ زرد .... آنکھیں پھٹیں .... دل کی یہ حالت جیسے اب دھڑکتے دھڑکتے بند ہو جائے گا۔

کسی نے زور سے کواڑوں کو دھکا دیا ...... ماں نے

ہکلاتے ہوئے کہا ۔ " کوئی ہمارے دروازے کو دھکا دے رہا ہے .... شاید تمہارے ابا آئے ہوں ؟ "

" میں دیکھوں جا کر ؟ " ستارہ نے پوچھا ۔

" نہ .... نہ .... نہ ایسا غضب نہ کیجیو بچی .... وہ ہوں گے تو آواز دیں گے ۔ "

" اماں ادھر کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیں کہ کیا قصہ ہے ۔ " نجمہ نے کہا ۔

" مجھے ڈر لگتا ہے بیٹی کہ کہیں کوئی گولی .... اللہ نہ کرے .... " ماں جملہ پورا نہ کر سکیں ۔

" اماں جی ہم ذرا سی ریخ آہستہ سے کھول کر دیکھیں گے .... " یہ کہہ کر دونوں بہنیں تیزی سے مگر دبے پاؤں اوپر گئیں ۔ اور چند لمحے کے بعد لرزتی ہوئی آئیں اور آ کر ماں سے لپٹ گئیں .... دروازے پر برابر دھکے پڑ رہے تھے ۔

لڑکیوں کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی ....... " اماں جی ... اماں جی ... باہر ... باہر ... کئی آدمی ... کھڑے ہیں ... کیا ہوگا اماں ... کون بچائے گا اماں ... ؟ ہائے اماں جی ... اماں جی ... "

ماں نے دونوں بچیوں کو زور سے سینے سے لپٹا لیا اور انگلی آسمان کی طرف اٹھائی " وہ ہے مدد کرنے والا ۔ "

دروازے پر اب زور زور سے چوٹیں پڑ رہی تھیں .... ماں ایک منٹ تک آنکھیں بند کیے کچھ سوچتی رہی اور پھر تیز لہجے میں بولی " میری جان ... میں تم پر صدقے ... ہمت

سے کام لو ، خدا پر بھروسا رکھو . . . اگر موت کا وقت آگیا ہے تو کوئی فکر نہیں ، مرنا ایک دن سب کو ہے ، اس سے کیا ڈرنا ! پر ماں صدقے اپنی آبرو جان دے کر بھی بچانا . . . . جاؤ تم دونوں لپک کر کوئلے لکڑی کی کوٹھڑی میں گھس کر اندر سے بند کرلو اور کاٹ کباڑ کے پیچھے چھپ جاؤ . . . شاید ان غارت ہونوں . . . جھاڑو ماروں کا منحوس قدم وہاں تک نہ پہنچے . . . "

" ہائے آپ کو یہاں اکیلا چھوڑ دیں ! "

" جلدی کرو . . . بیٹی جلدی کرو . . . مجھے یہاں رہنے دو . . . میری فکر کرنے کا وقت نہیں . . . میری جان جائے تو بلا سے . . . صدقے کی تھی تم پر سے ہزار دفعہ . . . پر تمھاری . . . ہائے میری جان . . . تمھاری آبرو خطرے میں ہے . . . جاؤ جلدی کرو . . . . دروازہ ٹوٹنے کے قریب ہے۔"

نجمہ اور ستارہ ایک منٹ تک زور سے ماں کے گلے سے لپٹی رہیں اور پھر بھاگ کر لکڑی اور کوئلے کی کوٹھری میں گھس کر اسے اندر سے بند کرلیا۔

ماں نے اپنا سر حافظ حقیقی [۱] کی بارگاہ میں جھکا دیا اور زندگی میں پہلی بار انتہائی خلوص ، انتہائی عاجزی ، انتہائی عقیدت کے ساتھ اپنی بچیوں کے لیے دعا مانگنے لگی۔ منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ہونٹوں کو ذرا سی حرکت نہ تھی . . . . ہاں آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ضرور جاری تھا اور دل براہ راست اپنے مالک سے التجا کر رہا تھا۔

---

۱ - یعنی خداوند کریم -

پرانے زمانے کے بنے ہوئے مضبوط اور بھاری کواڑوں نے جہاں تک ہو سکا اپنے مالکوں کے بچانے کی کوشش کی اور مسلسل پندرہ منٹ تک آٹھ سات آدمیوں کی چوٹوں کا مقابلہ کرتے رہے .... لیکن آخر کہاں تک ؟ ایک دلخراش اور خوفناک آواز کے ساتھ بے جان محافظ بے زبان سپاہی زخمی اور پسپا ہوکر زمین پر گر پڑے .... دشمنوں کے لیے راستہ صاف ہو گیا ۔ بھوکے بھیڑیے ... خونخوار درندے ... سارے گھر میں دوڑنے اور اپنے شکاروں کو تلاش کرنے لگے ۔ کچھ گھر کا سامان لوٹنے اور توڑنے پھوڑنے میں مصروف ہوگئے اور کچھ آدمیوں کی تلاش کرنے میں ....

انھوں نے دیکھا .... ایک کونے میں لکڑی کی چوکی پر ایک انسانی گٹھڑی سارے بدن کو چادر سے چھپائے اوندھی پڑی ہے .... ان درندوں نے جنھیں قدرت نے حیوان ناطق بنا کر انسانیت کے نام کو دھبہ لگایا تھا .... پہلے اپنی زبان کے گندے ہتھیار استعمال کیے مگر بڑی بی نے کسی بات کا جواب نہ دیا ، نہ سجدے سے سر آٹھایا ۔ جواب نہ ملنے پر انھیں نماز کی چوکی پر سے گھسیٹ لیا گیا اور یہ دیکھ کر ان کا شکار محض ایک سفید سر اور جھریوں بھرے چہرے والی بڑھیا ہے ان کی حیوانیت اور ہوسناکی قہر اور غضب سے بدل گئی ۔ بڑی بی کو ڈرا دھمکا کر نیزوں اور کرپانوں کی نوکیں چبھا چبھا کر ہر طرح سے گھر کے دوسرے لوگوں کا پتا پوچھا گیا ، لیکن بڑی بی نے ان پاگل کتوں کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا — اور اس حالت میں بھی وہ اپنا بوڑھا سرد چہرہ اجنبی لوگوں کی نظروں سے بچانے کے لیے کانپتے ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے تھیں

.... اور "یا اللہ .... یا اللہ" کے سوا کوئی لفظ ان کے متحرک ہونٹوں سے نہیں نکل رہا تھا۔

چند منٹ میں ان کا نحیف و نزار جسم ہتھیاروں سے چھلنی خاک و خون میں لتھڑا زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ہاتھ اب تک چہرے کو ڈھانپے تھے۔ جن کی پشت پر بہت سے کرپانوں اور چاقوؤں کے گھاؤ لگے تھے۔ اور ان کی روح اپنے حافظ حقیقی کی بارگاہ میں فریاد کرنے کے لیے جا چکی تھی۔

بڑی بی کو شہید کرنے کے بعد انھوں نے سارا گھر چھان مارا .... ہر کام کی چیز لوٹ لی .... جو بے کار سمجھی، اسے توڑ پھوڑ کر ڈال دیا .... اور آخر کار ان کے منحوس قدم لکڑی کی کوٹھری کی طرف بڑھے .... اور اسے اندر سے بند پا کر انھیں یقین ہو گیا کہ ان کے اصلی شکار اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔

ستارہ اور نجمہ ایک دوسرے سے لپٹی لکڑیوں کے ڈھیر کی آڑ میں کوئلے کی پرانی بوریاں اوڑھے دم سادھے بیٹھی تھیں۔ گھر کی تباہی، باپ کی جان کا خوف، ماں کی شہادت، یوسف کی محبت .... اس وقت سب جذبات و خیالات سے بیگانہ و بے حس، اس وقت صدق دل سے صرف یہ دعا کر رہی تھیں کہ ان کو اس وقت موت آجائے اور ان کی عزت ان وحشیوں سے محفوظ رہے .... دروازے پر چوٹیں پڑ رہی تھیں اور یہ دونوں بے کس و بے بس بہنیں ایک دوسرے کو زور سے پکڑے بے حس و حرکت پتھر کی بے جان مورتیوں کی طرح بیٹھی تھیں۔

# میرزا ادیب

میرزا ادیب نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی، روزگار اور معاش کی مشکلات سے ان کو ہمیشہ دو چار رہنا پڑا۔ پہلی جنگ عظیم نے دنیا پر جو بے یقینی مسلط کر رکھی تھی، اس کے درمیان میرزا ادیب نے آنکھ کھولی۔ اس افراتفری کے دور میں انہوں نے علم و ادب کی مشعل کو کبھی اپنے سے الگ نہ رکھا۔ شاعری سے فطری ذوق کا یہ عالم تھا کہ دسویں جماعت ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے، آنرز کیا۔ کالج سے نکل کر پھر وہی تلاش معاش کا چکر شروع ہو گیا۔ اس نے ان کی فطری صلاحیتوں کو بڑی حد تک کچل کر رکھ دیا، مگر یہ ڈوبا ہوا تارا نمودار ہو کر رہا۔ میرزا ادیب نے اٹھارہ سال کے عرصہ میں بہت کچھ لکھا ہے، جس میں ڈرامے، افسانے اور متنوع مضامین سب کچھ شامل ہیں۔

میرزا ادیب ترقی پسند لکھنے والوں کے اولین قافلے سے تعلق رکھنے والے ہیں، لیکن بقول ابراہیم جلیس "یہ بات انہیں یاران قافلہ سے خاص طور پر ممتاز کرتی ہے کہ میرزا صاحب ابھی تک روز اول کی سی تازگی

اور شگفتگی کے ساتھ سرگرم سفر ہیں جب کہ ان کے بہت سے ساتھی یا تو تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں یا پھر کبھی کبھار نظر آتے ہیں۔"

میرزا ادیب کے ڈرامے عموماً سماجی آویزش کے مرہون منت ہیں۔ ان کے ہاں کلاسیکی ڈرامہ کی ہمہ گیری نہیں ہے۔ یہ عموماً ایک ایکٹ سے آگے نہیں بڑھتے اور ایک ایکٹ میں زندگی کی مختصر کینوس کو پیش کرتے ہیں۔ میرزا ادیب کے یہاں تغیر پسندی ہے اور کہیں کہیں جذباتیت بھی۔ میرزا ادیب زندگی میں میانہ روی اور اعتدال کے قائل ہیں۔ اس لیے سماجی زندگی کے ان غیر معتدل عناصر کو پیش کرتے ہیں اور اسی سے کردار کا تضاد اور ڈرامے کی بنیادی آویزش فراہم کرتے ہیں۔

وہ کردار نگاری کو اس قدر اہمیت نہیں دیتے جتنی عہد حاضر کے اکثر ڈراما نویس دینے لگے ہیں۔ اُن کے کرداروں میں غیر معمولی کردار نہیں ہوتے اور رومانوی کردار بہت کم ہوتے ہیں۔ میرزا کے کردار عام زندگی کی تصویریں ہیں۔ میرزا آسان، سیدھی سادی روزمرہ بول چال کی زبان لکھتے ہیں۔

# فن کار

## کردار

سرفراز ........ مصور

عصمت ........ سرفراز کی بیوی

جیواں ........ بوڑھی ہمسائی جو ناک میں بولتی ہے - ان کے علاوہ تین آدمی

## منظر

مصور سرفراز کا گھر جو ایک کوٹھڑی اور ایک دالان پر مشتمل ہے - کمرہ بہ یک وقت ڈرائنگ روم ، خواب گاہ اور اسٹوڈیو بھی ہے اور اس لحاظ سے ادنیٰ درجے کا جتنا سامان اکٹھا ہو سکتا ہے سب کا سب اس کمرے میں بکھرا پڑا ہے -

دیواروں پر سرفراز کی اپنی بنائی ہوئی تصویریں لٹک رہی ہیں جن کا رنگ و روغن دھوئیں اور گرد و غبار سے خراب ہو چکا ہے - شمالی دیوار کے ساتھ چارپائی پر مصور کی بیوی عصمت لحاف اوڑھے لیٹی ہے - سوائے سر اور چہرے کے سارا جسم لحاف کے اندر ہے -

کمرے کے دوسرے کونے میں صحن والے دروازے سے ٹیک لگائے سرفراز کسی فکر میں غرق ہے - اس کے آگے ایک سفید کاغذ پڑا ہے ..... چند لمحے وہ سفید کاغذ کو گھور کر دیکھتا

رہتا ہے - دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کرتا ہے ، پھر پاس پڑی ہوئی تپائی پر سے کوئی کتاب اُٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہے .... کتاب چھوڑ دیتا ہے - بیڑی سلگاتا ہے اور اس کے کش لینے لگتا ہے - عصمت کھانستی ہے - سرفراز اُٹھ کر اس کے پاس جاتا ہے -

سرفراز : ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی ، سر کا کیا حال ہے ؟

عصمت : ( لہجہ میں بیزاری ) خاک ٹھیک ہوئی ہے طبیعت ! سر میں سخت درد محسوس ہو رہا ہے -

سرفراز : بری خبر -

عصمت : سر پھٹا جا رہا ہے - اور وہ جو رات دال کھائی تھی اس کی وجہ سے معدہ خراب ہے .... کھانسی بھی شروع ہو گئی ہے - تم کہو .... (کھانستے ہوئے) ٹائیٹل بنا لیا ہے نا ؟

سرفراز : ٹائیٹل — ! اونہوں ( نفی میں سر ہلا دیتا ہے ) کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے ، بناؤں کیا ؟

عصمت : ( ذرا چیخ کر ) ہائے صبح سے بیٹھے ہو اور ابھی تک ٹائیٹل ہی نہیں بنا سکے ، خبر ہے پبلشر کو چار بجے آنا ہے - کیا دو گے اسے ؟ یوں ہی پیسے دے دے گا نا وہ خیرات میں ، توبہ ! ...... دو دن سے چیخ رہی ہوں کہ تمام کی تمام رقم ختم ہو چکی ہے ، تکیے کے نیچے صرف دو روپیہ سات آنے پڑے ہیں - کب تک گزارہ ہوگا ان میں - ایک مصیبت ہو تو انسان سہے بھی - تم نے تو لٹیا ہی ڈبو دی ہے -

( سرفراز بیڑی کے جلدی جلدی کش لیتا رہتا ہے - )

سرفراز : بیگم میں کیا کروں آخر، دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ تم ہی کچھ بتاؤ کیا کروں ؟

عصمت : مزے سے فاقے کرو اور ساتھ مجھے بھی مارو۔ اور کیا کروگے تم بھلا۔ (جیسے درد سے بیقرار ہو کر) ہائے پیٹ۔

سرفراز : کیا ہوا ؟

عصمت : درد ہے پیٹ میں دیکھتے نہیں ؟

سرفراز : ابھی تو سر میں درد تھا۔

عصمت : تو کیا پیٹ میں درد نہیں ہو سکتا۔ کس شان سے فرمایا جاتا ہے۔ (نقل اتارتے ہوئے) ابھی تو سر میں درد تھا۔

سرفراز : (ہنس کر) خوب !

عصمت : اب مذاق کی سوجھ رہی ہے حضور کو !

سرفراز : ہرگز نہیں، تمھارے سر میں درد ہو اور پیٹ میں بھی ہونے لگے اور میں مذاق کروں ؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

عصمت : تمھیں درد ہو تو پتا چلے نا !

سرفراز : میں نے ہزار بار کہا کہ یہ دال نہ پکایا کرو۔

عصمت : اچھا جی نہیں پکایا کروں گی، مگر ہر روز سبزی گوشت کہاں سے آئے گا ؟ اوقات کیا ہے ہماری ؟ اگر یہی حالت رہی اور تمھارا دماغ یوں ہی بے کار رہا تو ایک روز یقیناً دال بھی نہیں پک سکے گی اور کیا ؟ ابھی دھوبی کے پیسے دینا ہیں . . . . سبزی

والے کے الگ مقروض ہیں اور صبح ہی صبح اماں فاطمہ بھی قرض کا تقاضا کرنے آئی تھیں۔ کیوں نہ مانگے اپنا روپیہ؟ کتنے دن گذر چکے ہیں، کچھ خیال بھی ہے جناب کو؟

سرفراز : مابدولت کو سب خیال ہے۔

عصمت : مابدولت کی حالت تو کوئی دیکھے آکر (آہ بھر کر) اللہ ہی جانتا ہے کس طرح زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ میں روٹی، وہ کون سی اللہ ماری گھڑی تھی جب اس منحوس گھر میں قدم رکھا تھا۔

سرفراز : بیگم رائی [1] کا پہاڑ نہ بنایا کرو۔

عصمت : اچھا تو ہم رائی کا پہاڑ بناتے ہیں! گھر میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے نا!

سرفراز : دیکھو نا بیگم (لہجے میں سنجیدگی) میں کہتا ہوں .......۔

عصمت : کیا کہتے ہیں آپ؟

سرفراز : بیگم تمہیں معلوم نہیں تمہاری یہ حالت دیکھ دیکھ کر میرا دل کس قدر کڑھتا رہتا ہے۔ مگر کیا کروں؟ کس کا دل نہیں چاہتا کہ اطمینان سے زندگی بسر کرے؟

عصمت : تمہارا دل تو بالکل نہیں چاہتا۔

سرفراز : کس طرح کہہ سکتی ہو تم؟

---

۱۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دینا۔

عصمت : ذرا غور کرو ۔ تمھارے دوست اور ساتھی کہاں سے کہاں جا پہنچے، لیکن تم ابھی تک وہیں ہو، بلکہ اور پیچھے ہٹ گئے - ترقی دنیا میں عقل مند آدمی کرتے ہیں بیوقوف نہیں ۔

سرفراز : سچ کہتی ہو بیگم ۔ اس سے زیادہ بے وقوفی اور کیا ہوگی کہ مصوری کو ذریعہ معاش بنائے بیٹھا ہوں ۔ کوئی انتہا بھی ہے حماقت کی ۔

عصمت : توبہ کس طرح بات کو مذاق میں ٹالا جارہا ہے ۔

سرفراز : بالکل سچ .... کہہ رہا ہوں ۔ جی چاہتا ہے کوئی اور کام شروع کر دیا جائے ۔ پر اور کوئی کام کر ہی نہیں سکتا ۔ اب کہاں نئی دنیا بسائی جائے۔

عصمت : تو مزے کرو، صبح سے ایک ٹائیٹل بھی نہیں بن سکا۔

سرفراز : یہ تو درست ہے ۔

عصمت : اب کیا ہوگا ؟

سرفراز : میرا خیال ہے بیگم اگر اس وقت گرم گرم چائے کا ایک آدھ کپ پی لیا جائے تو ممکن ہے سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھیں ۔

عصمت : ہاں یہ تو ہوگا ہی — گلا گھونٹ کر کیوں نہیں مار دیتے ۔ ہمیشہ کے لیے قصہ ہی ختم ہو جائے ۔ درد سے سر پھٹا جا رہا ہے ، پیٹ میں درد الگ ہے ۔ کھانسی رکنے کا نام نہیں لیتی ، اس پر فرمایا جا رہا ہے گرم گرم چائے تیار کر دو ۔ توبہ میرے اللہ — ستا لو جی بھر کے ، پھر شاید کبھی موقع نہ مل سکے ۔

( انگلیوں سے رخسار اس طرح پونچھتی ہے جیسے رو رہی ہو ) ۔

سرفراز : بھئی اس بگڑنے کی کیا ضرورت ہے ۔ بازار میں کئی ہوٹل ہیں اور ہر ہوٹل سے چائے منگوائی جاسکتی ہے؟

عصمت : یوں ہی بگڑ رہی ہوں نا ؟

سرفراز : اور کیا ؟

عصمت : جی ہاں ۔ دماغ جو خراب ہوگیا ہے ۔ کیوں نہ بگڑوں گی بھلا ۔

سرفراز : دیکھو بیگم !

عصمت : چھوڑ آؤ پاگل خانے میں جاکر ۔ کہیں تمہیں کاٹ نہ کھاؤں !

سرفراز : آخر ہو کیا گیا ہے تمہیں ؟

عصمت : ( سچ مچ روتے ہوئے ) یوں ہی بگڑ رہی ہوں ۔ یہ بات کہتے ہوئے تمہیں شرم تو نہیں آتی ؟

سرفراز : ( خفا ہوکر ) بیگم ! میں یہ ہر وقت کے طعنے برداشت نہیں کر سکتا ۔ میں پوچھتا ہوں آخر شادی کیوں کی تھی ۔ کیا تمہیں خبر نہیں ایک فن کار کی اس ملک میں مالی حالت کیا ہوتی ہے ۔ اب چیخ کیوں رہی ہو ۔ اس روز روز کی چیخ پکار نے تو میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے ۔

عصمت : اور میری زندگی جنت ہے نا ! دیکھتے نہیں کتنا آرام میسر ہے مجھے ، دو دن سے چارپائی پر پڑی ہوں اور سارا گھر کباڑ خانہ بن گیا ہے ۔ کوئی چیز بھی ٹھکانے

پر نہیں رہی - نفاست تو تمہیں چھوکر بھی نہیں گئی ، بڑے مصور بنے پھرتے ہو اور گھر کا یہ حال ہے -

سرفراز : گھر کی صفائی میرا نہیں تمہارا فرض ہے -

عصمت : اب قبر سے اٹھ کر آؤں گی گھر کی صفائی کے لیے -

( وقفہ )

سرفراز : بیگم ( نرم لہجے میں ) میں نے کہا ....

عصمت : ( بدستور گرم لہجے میں ) کیا ہے کوئی کسر باقی رہ گئی ہے کیا ؟

سرفراز : ذرا تحمل سے کام لو -

عصمت : تحمل سے کام لیتے لیتے تو قبر میں پہنچ چکی ہوں -

سرفراز : ( گرج کر ) تم تو پاگل ہوگئی ہو اور مجھے بھی پاگل کرکے چھوڑوگی -

عصمت : یہی ہوگا آخرکار -

سرفراز : زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ، گلاس کہاں ہے ؟

عصمت : کیا خبر مجھے ؟

سرفراز : ( کونے میں برتنوں کا ڈھیر دیکھ کر ) یہ تو سب گندے پڑے ہیں -

عصمت : صاف کونسی چیز ہے اس گھر میں ؟

سرفراز : ( ایک گلاس اٹھاکر ) جی چاہتا ہے سب کے سب

---

۱ - قوت برداشت - صبر -

پھینک دوں باہر گلی میں - ایک برتن بھی صاف ستھرا نہیں -

عصمت : تو میں سر پیٹوں اپنا !

سرفراز : (گرج کر) بس خاموش رہو - انتہا ہو چکی ہے - زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں - گھر کیا ہے دوزخ کا نمونہ ہے -

(سرفراز دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے - عصمت نڈھال ہو کر سسکیاں بھرنے لگتی ہے - دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے - چند لمحے گزر جاتے ہیں . . سرفراز واپس آتا ہے - چہرہ سرخ ہے - بیوی کے پاس آ کر رک جاتا ہے - عصمت ابھی تک سسکیاں بھر رہی ہے) -

سرفراز : (آواز میں مسرت کی لرزش) بیگم !

(عصمت جواب نہیں دیتی)

میں نے کہا عصمت بیگم (عصمت لحاف میں منہ چھپا لیتی ہے) ارے منہ کیوں چھپا لیا لحاف میں ذرا دیکھو تو سہی - میں نے کہا عصمت بانو خدا کی قسم ایک ایسا حادثہ پیش آیا ہے کہ خوشی سے اچھل پڑوگی - ذرا دیکھو تو -

عصمت : (لہجے میں بیزاری) سونے مرنے دو -

سرفراز : یہ دیکھو تو کیا ہے میرے ہاتھ میں دیکھو - (جیب سے ایک لفافہ نکالتا ہے) -

عصمت : میں نہیں دیکھتی - خدا کے لیے زیادہ پریشان نہ کرو - چھلانگ لگا کر مرجاؤں گی گلی میں -

سرفراز : یوں نہیں مانوگی (لحاف میں ہاتھ ڈال کر گدگدی کرتا ہے ، لحاف ہٹ جاتا ہے)۔

عصمت : ہائے اللہ چھوڑو ... گدگدی کرتے شرم تو نہیں آتی ہوگی ۔

سرفراز : دیکھتی کیوں نہیں ۔

عصمت : کیا دیکھوں ؟

سرفراز : (لفافے سے نوٹ نکالتے ہوئے)
یہ نوٹ سو سو کے ۔

عصمت : کیا ؟ (نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) دکھاؤ ۔

سرفراز : اونہوں ۔

عصمت : (بیٹھ کر) کہاں سے آئے !

سرفراز : ارے تم تو بیٹھ گئی ہو ۔ ابھی تو قبر کے کنارے پہنچ گئی تھیں ۔

عصمت : دکھاؤ ذرا ۔

سرفراز : (ذرا دور سے دکھاتے ہوئے) سچ مچ کے نوٹ ہیں ۔ سادہ کاغذ نہیں ۔

عصمت : ملے کہاں سے ؟

سرفراز : (بیوی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے)
واہ کیسی چمک آگئی ہے آنکھوں میں ۔

عصمت : میں پوچھتی ہوں آئے کہاں سے ؟

سرفراز : بس یوں ہی سمجھ لو الہ دین کا چراغ ہمارے ہاتھ

آگیا تھا ، ادھر رگڑا اُدھر جن حاضر ہوگیا - ہم نے حکم دیا - دیکھو ہماری بیگم بہت خطرناک حد تک بگڑ رہی ہیں بلکہ روٹھ کے قبر کے کنارے تک جا پہنچی ہیں - اس لیے فوراً ایک ہزار کے نوٹ لے آؤ - وہ لے آیا - قصہ ختم -

عصمت : بھئی مذاق وذاق چھوڑو - سچ مچ بتاؤ یہ لفافہ ملا کہاں سے ؟ ...... دیکھو ذرا - ( عصمت لفافہ لیتی ہے ) اس پر تو تمھارا نام بھی نہیں -

سرفراز : لفافے پر میرا نام تو نہیں مگر اور کس کا ہے ؟

عصمت : نام تو نہیں ، تو ڈاکیا دے کیوں کر گیا ؟

سرفراز : ڈاکیا کہاں آیا تھا یہاں ؟ دینے والے کا مقصد صرف یہ تھا کہ نوٹ پہنچ جائیں اور یہ پہنچ گئے ہیں -

عصمت : کس نے دیے ! کیسے ملے ..... معما ا کیا ہے یہ ؟

سرفراز : آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے ؟

عصمت : بہر حال یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ آم گرے کس پیڑ سے ہیں ؟

سرفراز : اس کی ضرورت نہیں - ہمیں روپوں کی اشد ضرورت تھی اور وہ ہمیں مل گئے - اور کیا چاہیے -

عصمت : بتاتے کیوں نہیں ؟ خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہو -

سرفراز : بات یہ ہے عصمت بانو کہ یہ کسی ایسے شخص

---

۱ - پیچیدہ بات -

نے بوچھے ہیں جسے میں جانتا ہی نہیں۔

عصمت : جسے میں جانتا ہی نہیں ..... یہ کیا بات ہوئی بھلا ؟

سرفراز : اگر جانتا ہوتا تو نام بتانے میں کیا ہرج تھا ؟

عصمت : ہے وہ کون ؟

سرفراز : کوئی مداح میرے فن کا .... کوئی عقیدت مند ہے۔ جسے میرے فن سے گہری دلچسپی ہے۔

عصمت : رہتا کہاں ہے ؟

سرفراز : میں کہہ رہا ہوں کہ میں اس کا نام تک نہیں جانتا۔

عصمت : نام کیوں نہیں پوچھا۔

سرفراز : مجھ سے ملتا تو نام بھی پوچھتا نا۔

عصمت : ملا بھی نہیں ؟

سرفراز : اونہوں۔

عصمت : ہائے اللہ یہ پہیلی کیا ہے۔ خدا کی قسم بہت پریشان کر رہے ہو۔

سرفراز : بیگم واقعہ صرف یہ ہے کہ تم سے لڑکر باہر جا رہا تھا کہ باہر ڈیوڑھی والے دروازے کے پاس ایک لفافے پر نظر پڑی۔ یہی ہے وہ لفافہ۔ کھولا تو چودہ طبق [1] روشن ہو گئے۔

---

[1] - طبق کے معنی تہال کے ہیں۔ یہاں مراد انتہائی خوشی سے ہیں کہ گویا ساتوں آسمان اور ساتوں زمین کے پردے میرے لیے کھل گئے۔

عصمت : وہاں کس نے رکھا تھا ؟

سرفراز : یہ عقیدت مندی کے کرشمے ہیں ۔

عصمت : پہلے تو کبھی یہ کرشمہ نہیں ہوا تھا آج یکایک یہ کیسے ہو گیا ؟

سرفراز : ہر روز یہ کرشمے نہیں ہوتے ۔

عصمت : تمھارا بھی کوئی عقیدت مند ہوگا ...... یہ مجھے معلوم نہیں تھا ۔ مگر اس بھلے مانس نے لفافہ ہاتھ میں دیا ہوتا ۔ منی آرڈر کے ذریعہ بھیجا ہوتا ۔ رجسٹری کی ہوتی ۔

سرفراز : یہ بات تمھارے ذہن میں کبھی نہ آئے گی ۔

عصمت : کونسی بات ؟

سرفراز : عقیدت مندی کا جذبہ تکلف سے بہت بلند رہتا ہے ۔ عقیدت مند جب اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے تو وہ احسان نہیں کرتا ۔ کیا سمجھیں ؟

عصمت : پھر بھی ...... اور پھر یہ بھی دیکھو ۔ ڈیوڑھی میں پھینک گیا تھا ۔ اگر کسی اور کی نظر پڑ جاتی تو !

سرفراز : کیسے پڑ جاتی ؟

عصمت : جیسے تمھاری پڑ گئی ہے ۔

سرفراز : میرے لیے تو یہ ہے ہی ۔

عصمت : میں کچھ سمجھ نہیں سکی ۔

سرفراز : اس میں الجھن کیا ہے آخر ؟ معاملہ بالکل صاف ۔

یہ میرے کسی عقیدت مند کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ابھی پرسوں اخبار میں پڑھ رہا تھا کہ ایک مصنف بڑی تنگدستی سے گذر اوقات کررہا تھا۔ ایک دن صبح ہی صبح اسے ایک لفافہ ملتا ہے، کھول کر دیکھتا ہے تو اس میں دس ہزار کا چیک موجود ہے۔ ظاہر ہے یہ اس کے کسی عقیدت مند ہی نے ازراہ عقیدت اس کو بھیجا تھا۔ رڈیارڈ کپلنگ کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ کپلنگ کو کسی کا روپیہ ادا کرنا تھا۔ اس نے چیک بھیج دیا مگر یہ چیک کبھی کیش نہ ہوا۔

عصمت: کیوں ؟

سرفراز: جسے چیک ملا تھا وہ کپلنگ کا عقیدت مند تھا۔ اپنے ممدوح کے دستخط اسے اس قدر عزیز تھے کہ اس نے چیک کیش ہی نہیں کروایا۔

عصمت: اچھا !

سرفراز: ہم کپلنگ بننے سے تو رہے، تاہم مصوری کا فن بے آسرا بے سہارا بھی نہیں ہے، آج تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ خیر بتاؤ پروگرام کیا ہے ؟

عصمت: کیسا پروگرام ؟

سرفراز: یعنی اب ہمیں کیا کرنا ہوگا ؟ میرا خیال ہے سب سے پہلے ڈاکٹر کے یہاں جائیں گے، درد سے تمھارا سر پھٹا جا رہا ہے، معدہ خراب ہے اور شدید کھانسی بھی آرہی ہے۔

عصمت: اوہ (ذرا مسکرا کر) اس کی پروا نہ کرو۔ تکلیف ہے مگر اس قدر نہیں کہ فوراً ڈاکٹر کے پاس بھاگا جائے۔

سرفراز: تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔

عصمت: وہ تو تم جانتے ہی ہو جب آدمی پریشان ہوتا ہے تو (مسکرا کر) کسی قدر پاگل ہو جاتا ہے۔

سرفراز: مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر کے یہاں جانے کی ضرورت نہیں۔

عصمت: جی نہیں۔

سرفراز: پر بازار تو جانا ہی پڑے گا ...... تمھارے لیے دو جوڑے خریدنا ہی چاہئیں۔

عصمت: تمھارا لباس بھی تو ٹھیک نہیں۔

سرفراز: ایک آدھ جوڑا خرید لیں گے۔ اور ہاں یاد آیا، وہ آویزے تو ضرور خریدے جائیں گے جنھیں اس دن تم نے بڑی حسرت انگیز نظروں سے دیکھا تھا۔

عصمت: کون سے آویزے؟

سرفراز: وہی جو نازی کے کانوں میں جھلملا رہے تھے۔ مجھے معلوم ہے یہ کس دکان میں بکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمھارے لیے سینڈل تو آئیں گے ہی۔

عصمت: چوڑیاں ...... دیکھو نا سب کی سب ٹوٹ چکی ہیں۔

سرفراز: بازار جائیں اور عصمت بانو کے لیے چوڑیاں نہ خریدیں، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

عصمت : اوہ آج تو بڑی دریا دلی کا ثبوت دیا جا رہا ہے ۔

سرفراز : میں دل کا برا نہیں ہوں عصمت بانو ! جب گھر میں دریا بہنے لگے تو دریا دلی خود بخود آجاتی ہے ۔ مگر جب قطرے کو ترس رہے ہوں تو آدمی کتنا برا بن جاتا ہے ۔

عصمت : تم برے نہیں ہو ۔

سرفراز : یہ آج انکشاف ہوا تم پر ۔

عصمت : توبہ ! کیسی بری بات ہے ؟

سرفراز : کونسی ؟

عصمت : میں نے پریشانی میں نہ جانے تمہیں کیا کیا کہا ہوگا ؟ پاگل ہو گئی تھی میں ۔

سرفراز : اب ایسی باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں ۔

عصمت : ( لہجے میں شرمندگی کا احساس ) سچ مچ مجھے اس کا بہت افسوس ہے ۔ معاف کردو ۔

سرفراز : بیگم معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ میرا لہجہ بھی تو کافی تلخ ہو گیا تھا ۔

عصمت : بہر حال مجھے معاف کردو ۔

سرفراز : اچھا بھئی اگر تمھاری یہی خواہش ہے تو معاف کر دیا ، تم کو اور اپنے آپ کو بھی ۔ اب تو خوش ہونا ؟

عصمت : بڑی مہربانی ۔

سرفراز : کیسی عجیب بات ہے - ادھر ہم لڑتے رہے ادھر گھر کے دروازے پر زندگی مسرتوں کے شگفتہ پھول لیے ہمارا انتظار کرتی رہی - بیگم سچ کہتا ہوں جیسے ہی میری نظر لفافے پر پڑی کچھ محسوس ہوا، جیسے، جیسے کچھ عجیب ہی کیفیت تھی - اوہ! دماغ کہتا تھا لو وہ چیز آگئی جس سے زندگی میں بہار آتی ہے - جس سے پژمردہ پھول کھل جاتے ہیں اور جس کے دامن میں قوس قزح کی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں -

عصمت : کیسے شاعرانہ فقرے ہیں -

سرفراز : آج تو جی چاہتا ہے خوب شاعری کی جائے - بہار کی رنگینیاں اور مسکراہٹیں ذہن پر نشہ سا برسا رہی ہیں - ہر شے پر خوب صورتی چھائی ہوئی ہے - اختر شیرانی کا وہ شعر یاد آگیا ہے :

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے -

عصمت : میں نے اب عہد کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی نہیں لڑوں گی، کبھی تلخ بات زبان سے نہیں نکالوں گی -

سرفراز : ماضی کی باتیں ماضی کے ساتھ رخصت ہوگئیں - مستقبل خوشگوار بنانا چاہیے -

عصمت : یہ تو ہوگا ہی -

سرفراز : تو بیگم اگر تم اجازت دو تو جھٹ پٹ کتاب کا ٹائیٹل بنا دوں -

عصمت : جی چاہے تو بنا دو اور نہ چاہے تو نہ بناؤ ۔

سرفراز : ذہن میں ایک خیال آیا ہے ۔ واللہ پبلشر تڑپ اٹھے گا ۔

عصمت : بنا دو پھر ۔ میں تمھارے لیے چائے بناتی ہوں ۔ ٹھیک ہے نا !

سرفراز : نا بھئی یہ غضب نہ کرنا ۔ تمھارا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے ۔

عصمت : اب چھوڑو بھی نا یہ قصہ ۔ ٹھیک ٹھاک تو ہوں ۔

سرفراز : جیواں کو آواز دے دو ۔ لے آئے گی دودھ وغیرہ ۔

عصمت : اچھا ۔

(عصمت کمرے سے باہر نکل جاتی ہے ۔ سرفراز صحن والے دروازے سے ٹیک لگا کر تصویر بنانے لگتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گنگناتا جاتا ہے ۔

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے

عصمت واپس آتی ہے ۔ شوہر کو تصویر بناتے ہوئے دیکھتی ہے اور انگیٹھی میں کوئلے ڈالنے لگتی ہے ۔ جیواں آتی ہے )

جیواں : (ناک میں بولتی ہے ) کیا ہیں ۔

عصمت: دودھ لے آؤ آدھ سیر ۔

جیواں : آندھ سیر بانس ۔

سرفراز : (وہیں سے ) عصمت کتنے پیسے ہیں تمھارے پاس ؟

عصمت: تین روپے اور شاید سات آنے ۔

سرفراز: جیواں دو روپے کی مٹھائی لے آؤ ..... دو کی نہیں اڑھائی روپے کی ۔ آدھ سیر دودھ اور باقی جو بچے وہ تمہارا ۔

جیواں: واں واں .... آنج تو عینش ہیں ۔

سرفراز: عینش ہیں عینش ۔

عصمت: تکیہ کے نیچے پیسے پڑے ہیں ۔ اٹھالو جا کر ۔

جیواں: آنچھا ۔

(جیواں تکیہ کے نیچے سے پیسے نکالتی ہے . . . برتنوں میں سے گلاس اٹھاتی ہے .... سرفراز بدستور گنگنا رہا ہے . . . عصمت اٹھ کر شوہر کے پاس آتی ہے)

عصمت: خوب !

سرفراز: میرا گانا یا ٹائیٹل ؟

عصمت: یہ . . . . ٹائیٹل خوب سوجھا ہے ۔

سرفراز: دیکھ لو آج طبیعت زوروں پر ہے . . . . چاہوں تو دس کتابوں کے ٹائیٹل ابھی بنا سکتا ہوں ۔

عصمت: واقعی ۔

سرفراز: دیکھ لو کتنی جلدی ٹائیٹل مکمل کر لیا ہے ۔ بات یہ ہے کہ جب طبیعت میں امنگ ہو تو ہر کام آسان ہو جاتا ہے ۔ ٹائیٹل دیکھ کر مصنف اور پبلشر دونوں خوش ہو جائیں گے ۔

عصمت: خوش نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوگا ؟

سرفراز : میں نے کہا بیگم ایک پلیٹ صاف کر دو ۔

عصمت: مٹھائی کے لیے ؟

سرفراز : ہاں ۔

عصمت: اچھا ، جیواں نہیں آئی ابھی تک ؟

( جیواں آتی ہے ۔ ایک ہاتھ میں گلاس اور دوسرے میں مٹھائی کا لفافہ ہے ۔ )

سرفراز : آ تو گئی ہے ۔

عصمت: بڑی لمبی عمر ہے جیواں تیری ۔

جیواں : آنچھا . . . کہاں رنکھوں ؟

عصمت: دے دو مجھے ۔

جیواں دودھ والا گلاس عصمت کے پاس رکھ دیتی ہے اور لفافہ ہاتھ میں پکڑا دیتی ہے )

جیواں : آں . . . . بانہر تین آندمی پونچھتے ہیں ۔

سرفراز : مجھے ؟ . . . . اچھا کون ہیں یہ حضرات ؟

عصمت: پبلشر وغیرہ ہوں گے . . . . یا شاید وہی لوگ (مسکرا کر) آپ کے عقیدت مند ۔

سرفراز : ہو سکتا ہے ۔ دیکھتا ہوں باہر جا کر ۔

( جیواں چلی جاتی ہے ۔ سرفراز بھی دروازے سے نکل جاتا ہے ۔ عصمت مٹھائی پلیٹ میں ڈالتی ہے اور اسے تپائی کے اوپر رکھ کر رومال سے ڈھانپ دیتی ہے ۔ سرفراز واپس آتا ہے ) ۔

عصمت: کون ہیں ؟

سرفراز : تین معزز آدمی.... کہتے ہیں ملنے کا بڑا اشتیاق تھا ۔

عصمت: تو . . . . ؟

سرفراز : تو کیا . . . اندر بلانا چاہیے انھیں ۔

عصمت: بٹھائیں گے کہاں ؟

سرفراز : تم کوٹھری میں چلی جاؤ . . . . اور لباس تبدیل کرلو بازار جانے کے لیے ۔ میں چند منٹ آن سے باتیں کرتا ہوں ۔ ہاں بٹھائیں گے کہاں ، یہیں چار پائی پر بیٹھ جائیں گے ۔

( لحاف لپیٹ کر رکھ دیتا ہے ۔ دری کی شکنیں نکالنے لگتا ہے ) ۔

عصمت: اچھا

( عصمت کوٹھری کے اندر چلی جاتی ہے ۔ سرفراز دروازہ کے پاس کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہتا ہے ) ۔ تشریف لایے جناب ۔ ( دو خوش پوش شخص اور ایک معمولی لباس میں ملبوس آدمی داخل ہوتے ہیں ۔ )

سرفراز : معاف کیجیے جناب ، ایک مصور کی اتنی توفیق کہاں کہ کوئی شان دار ڈرائنگ روم بنا سکے ۔

پہلا آدمی : آپ تو ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں۔

سرفراز : تشریف رکھیے ۔ (چارپائی کی طرف اشارہ کر کے) بیٹھیے ۔

( تینوں چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں)

دوسرا آدمی: یہ کمرہ ہماری نظروں میں خوب صورت سے خوب صورت ڈرائنگ روم سے بھی بہتر ہے کیوں کہ یہاں ایک سچا فن کار کام کرتا ہے۔

سرفراز : یہ ......... آپ کی ذرہ نوازی ہے۔

پہلا آدمی: اس میں ذرہ نوازی کو قطعاً کوئی دخل نہیں۔ مدت سے آپ کا ذکر سن رہے تھے۔

دوسرا آدمی: اور آج ملاقات کا اشتیاق کشاں کشاں لے آیا ہے۔ (سرفراز تپائی چار پائی کے قریب لے آتا ہے اور پلیٹ پر سے رومال ہٹا دیتا ہے)۔

سرفراز : یہ لیجیے میری قدر افزائی کیجیے۔

پہلا آدمی: یہ کیا ؟ اس قدر تکلف۔

سرفراز : نہیں صاحب یہ میرا فرض ہے۔ لیجیے نا۔

دونوں خوش پوش کھانے لگتے ہیں۔ تیسرا چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ سرفراز کی اس کی طرف نظر نہیں جاتی) شرمندہ ہوں کہ خاطر خواہ تواضع نہیں کر سکا ... ایک مصور۔)

پہلا آدمی: ارے صاحب آپ کیا ہیں، یہ ہم جانتے ہیں۔

سرفراز : ہاں تو ..... ...... اس عزت افزائی کا کچھ مقصد بھی ہوگا۔

پہلا آدمی: جی ہاں .... ایک مقصد کے تحت ہی حاضر خدمت ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔

سرفراز : فرمایئے۔

دوسرا آدمی: اس سے پہلے مختصر سی تمہید سن لیجیے۔

پہلا آدمی: میں عرض کرتا ہوں۔ آج کل فن کی جو حالت ہے آپ سے پوشیدہ نہیں۔ آپ تو ماشاءاللہ خود اس دشت کی سیاحی میں مصروف ہیں۔

سرفراز : جی ہاں۔

دوسرا آدمی: یہاں چند اہلِ درد نے ایک انجمن کی بنیاد رکھی ہے۔ اس انجمن کا مقصد حیات صرف یہ ہے کہ ان فنکاروں کی مدد کی جائے جو بدقسمتی سے مالی الجھنوں میں مبتلا ہیں اور فن کی طرف پوری توجہ نہیں کرسکتے۔ ظاہر ہے کسی اثاثے [1] کے بغیر یہ انجمن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

سرفراز : بجا فرما رہے ہیں آپ۔

دوسرا آدمی: یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید ہر معقول آدمی کرے گا۔ تو جناب ہم نے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔

سرفراز : اس کے علاوہ سرمایہ جمع کرنے کی اور کوئی سبیل ہی نہیں۔

دوسرا آدمی: بالکل درست فرمایا آپ نے۔

پہلا آدمی: ہم جانتے ہیں کہ آپ ایک فنکار ہیں، اور آپ کی حالت عام فن کاروں سے مختلف نہیں ہوگی۔ تاہم یہ بھی خیال ہے شاید ان دنوں آپ کی کوئی تصویر فروخت ہو گئی ہو۔

---

۱ - پونجی۔

سرفراز : تصویر فروخت نہیں ہوئی ...... یہاں یہ فن سمجھنے والے ہی کتنے ہیں۔

پہلا آدمی : جی ہاں ۔

سرفراز : مگر آپ مایوس نہ ہوں ۔

دوسرا آدمی: کیا فرمایا آپ نے ؟

سرفراز : میں اس مقصد کے لیے ضرور چندہ دوں گا ۔

پہلا آدمی : جب ان دنوں آپ کی کوئی تصویر ہی نہیں بکی تو آپ سے چندہ طلب کرنا مناسب بات نہیں ہوگی ۔

سرفراز : نہیں صاحب میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا ۔ میری طرف سے پچاس روپیہ کی حقیر رقم منظور کر لیجیے ۔

دونوں آدمی: ( بیک وقت ) جی !

سرفراز : کاش میں زیادہ دے سکتا ۔

پہلا آدمی : مگر یہ آپ پر زیادتی ہوگی ۔

( تیسرا آدمی بالکل نہیں بولتا ۔ پاگلوں کی طرح ان کو دیکھتا رہتا ہے ۔)

سرفراز : نہیں صاحب ۔

دوسرا آدمی: مگر دیکھیے نا ! آپ کی حالت ۔

سرفراز : (مسکرا کر) آپ ایک گھنٹہ پیشتر آتے تو پچاس روپیہ کیا پچاس پیسے بھی نہ دے سکتا تھا ۔

پہلا آدمی: اچھا !

سرفراز : اب میں یہ رقم دے سکتا ہوں ۔

پہلا آدمی : خوب ! معلوم ہوتا ہے کہیں سے خزانہ مل گیا ہے ۔

سرفراز : خزانہ کہاں سے ملے گا صاحب ۔

پہلا آدمی : بات تو کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے ۔

سرفراز : واقعہ یہ ہے کہ آج ہمارے کسی عقیدت مند نے عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا ہے ۔

دوسرا آدمی : واقعی ؟

سرفراز : جی جناب ۔

پہلا آدمی : بہت نیک انسان ہوگا ۔ خدا سب کو ایسی توفیق دے ، ویسے یہ کوئی خاص حادثہ نہیں ، آپ ہیں ہی ایک عظیم مصور ۔

سرفراز : آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی بہت کرم فرمائی ہے بلکہ بہت بڑا مبالغہ ہے ۔

پہلا آدمی : ہم بالکل درست عرض کر رہے ہیں ۔ ہمیں یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ابھی دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ایک عظیم مصور کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔ مگر واقعہ کیا ہے ۔

سرفراز : معمولی سی بات تھی ۔ ہوا یہ کہ چائے لینے بازار جا رہا تھا کہ یکایک ڈیوڑھی میں ایک لفافے پر نظر پڑی ۔ اٹھایا تو اس میں ایک ہزار کے نوٹ تھے ۔

دونوں آدمی : (ایک ساتھ) بہت خوب !

سرفراز : وہ کپلنگ والا واقعہ آپ کو یاد ہوگا - یورپ میں یہ بات عام ہے -

پہلا آدمی : واہ واہ ......... سرفراز صاحب ، خدا کی قسم آپ واقعی ایک عظیم مصور ہیں - آپ نے تو ہمیں ذرہ برابر پریشان نہیں کیا -

سرفراز : (گھبرا کر) جی -

پہلا آدمی : ہمیں یقین نہیں تھا کہ معاملہ اتنی جلدی صاف ہو جائے گا -

سرفراز : میں سمجھا نہیں مطلب -

دوسرا آدمی : (ہنستا ہے) ایک فن کار ............ فن کار ہی ہوتا ہے -

سرفراز : نہ جانے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ؟

پہلا آدمی : ہم ...... یعنی میں اور یہ صاحب ، دونوں خفیہ پولیس کے آدمی ہیں -

سرفراز : (پریشان ہوکر) جی ...... مگر -

پہلا آدمی : (تیسرے آدمی کی طرف اشارہ کرکے) اور یہ حضرت ایک مجرم ؟

سرفراز : میں کچھ سمجھ نہیں رہا -

دوسرا آدمی : سنیے سرفراز صاحب - آپ دیکھ رہے ہیں ہمارے ساتھ (تیسرے آدمی کی طرف اشارہ کرکے) یہ صاحب بھی ہیں - یہی ہے وہ شخص جسے آپ اپنا

عقیدت مند سمجھ رہے ہیں ۔ میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا ۔ اصل واقعہ بتائے دیتا ہوں ۔ یہ شخص ایک مقامی بینک میں ملازم تھا ۔ اچھا خاصا شریف آدمی سمجھا جاتا تھا ۔ مگر آج اسے ہاتھ رنگنے کا موقع مل گیا ۔ اس نے کام کرتے کرتے کچھ نوٹ آڑا لیے اور فوراً منیجر سے چھٹی لے کر بینک کے باہر نکل آیا ۔ اسے اتفاق کہیے کہ ہم دونوں ایک خاص کام سے بینک میں موجود تھے ۔ ایک کلرک نے ان صاحب کو یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا ۔ خبر اسی وقت منیجر کو پہنچائی گئی اور منیجر نے ہمیں خبردار کر دیا ۔ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا ۔ آپ سمجھتے جا رہے ہیں نا ؟

سرفراز : ( مردہ آواز میں ) کہیے ۔

دوسرا آدمی : تو جناب ہم نے اس کا تعاقب شروع کر دیا اور دور جا کر پکڑ لیا ۔ اس نے بک دیا کہ بینک سے ایک ہزار کے نوٹ آڑائے تو تھے مگر ہمیں دیکھ کر راہ میں کسی گھر میں پھینک دے ۔ شک آپ کے مکان پر تھا ۔ ... اور معاف کیجیے گا ۔ ہم نے آپ کو بہت پریشان کر دیا ہے ، کیا کیا جائے ۔ فرض بہر صورت ادا کرنا ہی پڑتا ہے ۔

سرفراز : جی ۔

دوسرا آدمی : وہ لفافہ عنایت فرمادیں ، بینک کی رقم بینک ہی میں جانی چاہیے ۔

پہلا آدمی : ہوسکتا ہے ۔ آپ کے واقعی عقیدت مند موجود ہوں اور انہیں ابھی تک عقیدت کے اظہار کا موقع نہ ملا ہو ۔

دوسرا آدمی : وہ لفافہ دے دیجیے ۔ صرف ایک مرتبہ آپ کو اور تکلیف کرنی ہوگی عدالت میں ۔

سرفراز : مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں ۔

پہلا آدمی : دیکھیے نا سرفراز صاحب ! بحیثیت ایک ذمہ دار شہری کے آپ پر کچھ فرض بھی عائد ہوتے ہیں ، مگر یہ یقین رکھیے آپ کو زیادہ سے زیادہ سہولت دی جائے گی ۔

دوسرا آدمی : اچھا ۔

(سرفراز اُٹھتا ہے ......... کوٹھڑی کے اندر جاتا ہے ۔ اس اثناء میں وہ دونوں آدمی ایک دوسرے کو مسکرا مسکرا کر دیکھتے رہتے ہیں ۔ سرفراز واپس آتا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں لفافہ ہے جسے وہ پہلے آدمی کے حوالے کر دیتا ہے ۔ پہلا آدمی نوٹ گنتا ہے اور لفافہ جیب میں ڈال لیتا ہے)۔

پہلا آدمی : معاف کیجیے گا آپ کو بہت تکلیف دی ۔ اچھا خدا حافظ ۔

دوسرا آدمی : آپ کا حسن سلوک ہمیشہ یاد رہے گا ۔ (تینوں آدمی دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں ۔ عصمت باہر آتی ہے ۔)

عصمت : (لہجہ میں سخت غصہ) میں کہتی ہوں تم سا

بے وقوف آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوا ۔ لفافہ کا قصہ بتانے کی ضرورت کیا تھی ۔

سرفراز : وہ خفیہ پولیس کے آدمی تھے بیگم ۔

عصمت : مگر ان کے پاس اس کا کیا ثبوت تھا کہ لفافہ یہیں پھینکا گیا تھا۔ تم نے خود انہیں اطلاع دی شیخی میں آ کر ۔

سرفراز : لیکن بیگم ..........

عصمت : (بات کاٹتے ہوئے) لیکن ویکن کیا ؟ تم نے خود انہیں بتایا کہ میرے ایک عقیدت مند نے یہ لفافہ پھینکا تھا ۔

سرفراز : وہ مجھے گرفتار کر سکتے تھے بیگم ۔

عصمت : بڑے آئے مصور ... کس شان سے فرمانے لگے کہ ایک عقیدت مند نے عقیدت مندی کا ثبوت دیا ہے۔ توبہ اللہ ! تو مجھے موت دیدے ۔ چھوٹ جاؤں اس عذاب سے ۔ کباب ہو گئی ہوں اس شخص کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر ۔ کیا مجال جو کبھی کوئی عقل مندی کا کام بھی کر جائے۔

(رونے لگتی ہے ) ۔

یہ گھر یوں ہی جہنم بنا رہے گا ، میں اسی طرح تڑپتی رہوں گی ۔

سرفراز : بات بھی سنو بیگم ! معاملہ بڑا سنگین تھا ۔

عصمت : اور یہ معاملہ سنگین نہیں کہ گھر میں ایک دمڑی

بھی نہیں - سر پھٹا جا رہا ہے - معدہ سخت خراب ہے (کھانستی ہے) ہائے اللہ ! اٹھا لے مجھے اب تو - تیرا بڑا کرم ہوگا -

(باہر دروازے پر دستک)

سرفراز : سنو باہر کوئی ہے - شاید پبلشر ہے -

(ٹائیٹل اٹھا کر باہر نکل جاتا ہے -)

عصمت : موت آئی ہے اب -

(سرفراز باہر چلا جاتا ہے ، عصمت بستر پر گر کر سسکیاں بھرنے لگتی ہے ، سرفراز لوٹ کر آتا ہے - ہاتھ میں نوٹ ہے) -

سرفراز : بیگم موت تو نہیں آئی پبلشر آیا ہے — پچاس روپے دیے ہیں اس نے —— ٹائیٹل بہت پسند کیا ہے - چند چیزیں تو آتی جائیں گی ، اس رقم سے - اٹھو میری رانی (سرفراز اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے - عصمت برابر سکیاں بھرتی رہتی ہے -)

(پردہ)

SR No. 1751

کوڈ نمبر ایس ٹی بی — ۱

★ ★ ★



★ ★ ★ ★ ★

منظور و رائج کردہ

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ و سیکنڈری ایجوکیشن ،

حیدرآباد و کراچی

---

## پاکستان کا قومی ترانہ

پاک سرزمین! شاد باد: کشورِ حسین: شاد باد!
تو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین ! شاد باد !
پاک سرزمین کا نظام قوّتِ اُخوّتِ عوام
قوم ، مُلک ، سلطنت پائندہ ، تابندہ باد!
شاد باد منزلِ مُراد
پرچم ستارہ و ہلال رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی، شانِ حال جانِ اِستقبال
سایۂ خدائے ذُوالجلال

---



| تاریخ اشاعت | ایڈیشن نمبر | تعداد اشاعت | قیمت |
|---|---|---|---|
| اکتوبر 1972ء | پہلی بار | 4000 | |
| دسمبر 1972ء | دوسری بار | 4000 | 2.92 |

نیا اُردو نصاب

بشیر احمد صدیقی